بنو عباس کے دور اول میں

علم کلام اور علمائے متکلمین

ڈاکٹر سید شاہ محمد یحییٰ ابدالی

بنو عباس کے دور اول میں

علم کلام

اور علمائے متکلمین

ڈاکٹر سید شاہ محمد یحییٰ ابدالی

نام کتاب	علم کلام اور علمائے متکلمین
مصنف	ڈاکٹر سید شاہ محمد یحییٰ ابدالی
سنہ طباعت	2006
کمپوزنگ	اسٹار کمپیوٹرس، پتھر کی مسجد، پٹنہ ۶ فون 2689566
	موبائل 9835623533
مطبع	کوالیٹی آفسیٹ
ناشر	مصنف
قیمت	۱۰۰/ روپے صرف (-/Rs.100)

ملنے کے پتے

(۱) محمد اکرم رضا اسپوروی، شکور کالونی، سمن پورہ، پٹنہ

(۲) سید شاہ لطف علی، خانقاہ منیر شریف، پٹنہ

(۳) کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ

انتساب

حضرت مولانا سید شاہ محمد اسماعیل صاحب علیہ الرحمۃ
سابق سینیر مدرس، مدرسہ شمس الہدیٰ، پٹنہ

کے نام

جن کے علم وفضل، حسن اخلاق اور علوئے مرتبت نے

خاک پاک مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم

کا پیوند بنا دیا

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

فہرست مضامین

پیش لفظ

آج سے نصف صدی قبل یہ کتاب کامل (دکتور العلم) کی سند حاصل کرنے کے لئے لکھی گئی اور ۱۹۶۱ء میں ''ادارہ تحقیقات عربی وفارسی'' میں جمع کی گئی۔ امتحان بھی ہوا اور سند بھی ملی لیکن اس کی طباعت معرض التوا میں پڑی رہی۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ میں نے جتنی عجلت میں اس تحقیقی کام کو پورا کیا تھا اور کتابی شکل دی تھی، اس سے میں مطمئن نہیں تھا اور اس پر نظر ثانی بہت ضروری تھی۔ لیکن مرکز سے الگ رہنے، ملازمت کی پابندی اور پھر اپنے گونا گوں مسائل کی وجہ سے یہ کام التوا میں پڑتا رہا۔ نظر ثانی کے لئے مآخذ تک پہنچنا ضروری تھا اور اس کے لئے پٹنہ کا قیام ناگزیر۔ اس لئے ملازمت سے سبکدوشی تک اس کام کو اٹھا رکھا گیا۔ لیکن ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی کچھ ایسے حالات پیدا ہوتے گئے کہ یہ کام ترجیحی بنیاد پر نہ ہو سکا۔

خدا کا شکر ہے کہ اپنی علالت اور متعدد حادثوں کے باوجود مجھ میں اتنی طاقت رہی کہ میں پھر سے نوشت وخواند کی طرف رجوع کر سکا اور پہلی کتاب ایک شعری مجموعہ ''سامان رسوائی'' کے نام سے طبع ہوئی۔ دوسری کتاب جو میرا پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی ہے ''صوفیائے بہار کے ملفوظات ومکتوبات'' کے عنوان سے چھپی۔ تیسرے مرحلہ پر اس کام کو رکھا گیا، اس لئے کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا کہ اس کام میں محنت کچھ زیادہ تھی اور کافی وقت درکار تھا۔ جس عجلت میں یہ کتاب لکھی گئی اس کا سبب بھی اگلی سطروں میں وضاحت کے ساتھ کتاب کی تمہید میں آئے گا۔

لکھی ہوئی کتاب کو از سر نو پڑھنا اور پڑھنے کے قابل بنانا ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ بحمد اللہ اس مشکل مرحلہ میں مولانا محمد ابرار کریم صاحب نے ہمارا ساتھ دیا اور اس کام کو آسان بنادیا۔ میں تہہ دل سے ان کا شکر گزار ہوں، ورنہ میرا سارا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ جاتا۔ کسی نے سچ کہا ہے

مردے از غیب برون آید و کارے بکند

طباعت کے سارے مراحل اور ذمہ داریاں عزیزان گرامی جناب اکرم رضا صاحب سلمہ اور ابوالمظفر عالم سلمہ نے اپنے سر لے کر مجھے ہر طرح کے فکر و تردد سے آزاد کردیا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں عزیزوں کو دین و دنیا کی سرخروئی اور سرفرازی سے نوازے۔ آمین!

سید شاہ محمد یحییٰ ابدالی
منیر شریف
۱۵/اپریل ۲۰۰۵
9431218688

تمہید

۱۵/دسمبر ۱۹۵۸ء کو میں نے ''ادارہ تحقیقات عربی و فارسی'' میں کامل کی سند کے دو سالہ نصاب میں داخلہ لیا۔ ابتدا میں میرا موضوع تحقیق ''خلفائے بنوعباس کے دور میں مذہبی تحریکات'' قرار پایا۔ اور اس موضوع کے تحت تقریباً سات ماہ تک کام کرتا رہا۔ اس سلسلہ میں، میں نے مندرجہ ذیل ابواب قائم کیے تھے اور ان کے لیے تشفی بخش مواد بھی فراہم کرلیا تھا۔

(۱) فرقہ راوندی کی ابتدا اور ارتقا اور استیصال۔

(۲) استاذ سیس کا دعویٰ نبوت اور اس کا استیصال۔

(۳) حکیم مقنع خراسانی کا خروج، جنگ وجدال، عقائد، وسعت اور استیصال۔

(۴) بابک خرمی کا گروہ، اس کی طاقت، عقائد اور استیصال۔

(۵) خروج معتزلہ، ان کے اجمالی عقائد، طاقت اور خلفائے بنوعباسیہ کی پشت پناہی۔

(۶) فتنۂ خلق قرآن اور اس کے نتائج۔

لیکن میرے نگراں نے اچانک اس موضوع کے تحت آگے بڑھنے سے روک دیا اور نیا موضوع ''خلفائے عباسیہ کے دور اول میں علم کلام اور علمائے متکلمین'' پر تحقیقی کام شروع کرنے کی ہدایت فرمائی۔ سبب یہ بتایا کہ یہ موضوع بہت وسیع ہے اور دو سال میں اس پر کام مکمل نہیں ہو سکے گا۔ لیکن اس دو سال کے آٹھ ماہ تو دوسرے عنوان میں الجھا کر پہلے ہی ضائع کردیے گئے۔ اور اس کے بعد بھی ایسا موضوع دیا گیا جو اس سے کم مشکل اور وسیع نہ تھا۔ اس کے علاوہ حضرت علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمۃ جیسے

جید عالم دین اور ممتاز تاریخ داں جس موضوع پر خامہ فرسائی کر چکے ہیں میرے جیسے
کم علم طالب علم کے لئے اس پر کچھ لکھنا آفتاب کو چراغ دکھانے اور اپنی کم مائیگی کے
اشتہار کے مترادف ہوگا۔ میں نے وقت کی تنگی کا بھی عذر کیا اور کتابوں کی کمی کا تذکرہ
بھی ہوا۔ لیکن ان سب کے باوجود کون سنتا ہے ''فغان درویش'' نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اب
خوشی سے ہو یا مجبوری سے کام تو کرنا ہی تھا۔ ابواب کی ترتیب اور موضوع سے متعلق
ایک خاکہ تیار کیا اور میں نے کام کو دو حصوں (۱) علم کلام اور (۲) علمائے متکلمین پر
منقسم کر کے مواد کی فراہمی شروع کر دی۔ مگر پھر قدم قدم پر رکاوٹوں کا سلسلہ جان بوجھ
کر شروع کیا گیا اور اس میں پورا ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ مجبوراً مجھے ادارہ کے
ڈائرکٹر محترم جناب ڈاکٹر سید احمد صاحب مدظلہ (مرحوم) کے سامنے سارے حالات
رکھنے پڑے۔ انہوں نے پورے معاملہ پر غور و فکر کرنے کے بعد مجھے اپنی نگرانی میں
کام کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اور کمال شفقت و عنایت کا مظاہرہ کرتے ہوئے
میری مزید رہنمائی کے لئے مولانا شاہ اسماعیل صاحب مدظلہ (مرحوم) کو متعین فرمایا۔
چنانچہ اس طرح نئے عنوان کے تحت میں نے اپنی مدت تحقیق ختم ہوتے ہوتے مقالہ
مکمل کر لیا اور اس کی کتابت وغیرہ کے بعد آج مورخہ ۲۰ رجون ۱۹۶۱ء کو ادارۂ
تحقیقات میں یہ مقالہ جمع کر رہا ہوں۔ امید ہے جلد ہی اس کے معائنہ اور زبانی سوال و
جواب کے بعد سند تحقیق (کامل) کا ادارہ کے ذریعہ اجراء عمل میں آجائے گا۔

فھو المقصود

سید شاہ محمد یحییٰ ابدالی

یکم جون ۱۹۶۱ء

آغاز کتاب

انسان کی ابتدائی حالت کے متعلق تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ جنگل میں بود و باش اختیار کرنے کا جو نتیجہ ہوسکتا تھا وہی ہوا یعنی آپس میں جنگ وجدال، کشت وخون اور فتنہ وفساد ایک لازمی عنصر بن گیا۔ لیکن رفتہ رفتہ جب تہذیب وتمدن کے آثار ابھرنے لگے تو یہ احساس ہوا کہ نظم وضبط کے لئے کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کیا جائے جس کے تحت زندگی گزارنا آسان ہو جائے۔ یہیں سے یہ نظم و ضبط مذہب کی شکل میں وجود میں آیا۔ بعض علمائے تاریخ کا یہ کہنا ہے کہ مذہب اور انسان کا ساتھ ابتدائے آفرینش سے ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام پہلے انسان تھے اور پہلے نبی بھی اس لئے انسانوں کی اصلاح کا انتظام خدائے تعالیٰ نے اس کی تخلیق کے ساتھ ہی کر رکھا ہے۔ مذہب کا مقصد ہر ایسی غیر اخلاقی اور غیر انسانی حرکتوں کو روکنا ہے جو انسان کو انسانیت کے درجے سے گرادے اور وہ خالق کائنات سے اس طرح جڑ جائے کہ اپنی جسمانی تسکین کے ساتھ ساتھ روحانی سکون بھی حاصل کر سکے۔

دنیا میں جتنے مذاہب بھی اس وقت جاری ہیں ان کی تاریخ پر ایک نظر ڈالئے تو یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ ان کی توسیع واشاعت میں کسی زور اور زبردستی کا کوئی ہاتھ نہیں رہا ہے۔ بلکہ عوام نے اپنی زندگی سنوارنے کے لئے اسے نجات کا ایک ذریعہ سمجھا اور اختیار کرلیا۔ اگر نبی کی دعوت سے کچھ لوگوں کو اختلاف ہوا تو پھر ان ہی میں سے کچھ ایسے لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے جنہوں نے اس کی اشاعت کو اپنا نصب العین بنالیا۔ اس طرح ہر مذہب کی توسیع واشاعت عام انسانوں سے ہی ہوتی رہی۔

مذہب کے ذریعہ انسان کی ترقی بھی ہوئی اس لئے کہ اس کے اصول انسانی زندگی سے بہت مطابقت رکھتے تھے اور ہر ایسا اصول جو انسان کی فطرت سے

قریب ہو جلد اپنا لیا جاتا ہے۔ مذہب کی اسی خصوصیت نے عام انسانوں کو اس سے باندھ رکھا اور دنیا میں اسے افراط وتفریط، بے چینی و بدنظمی اور طاقت وقوت کے بیجا استعمال واظہار سے باز رکھا۔

مختلف ممالک میں انسانوں کی صورت وشکل جداگانہ ہونے کے باوجود ان میں ایک چیز مشترک ہوتی ہے جسے ہم ''فطرت'' کہتے ہیں اور یہی فطرت اسے مذہب کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ حدیث ہے ''کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ و یمجسانہ'' (ہر بچہ اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں) اس قول مبارک سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ہر بچہ اپنے آبائی مذہب کو ماحول کی بندش کی وجہ سے قبول کرتا ہے ورنہ حقیقت میں اس کی فطرت اس سے بیگانہ ہوتی ہے اور ایک ایسے اصول کی طرف رہنمائی کرتی رہتی ہے جو اس کی فطرت سے مطابقت رکھتا ہو۔ چنانچہ جب ہم تاریخ مذاہب کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات اور کھل کر اور واضح صورت میں سامنے آجاتی ہے کہ تمام بانیان مذہب یا مصلحین امت پر اصلاح کی ذمہ داریاں پڑنے سے قبل فطرت ان کی رہنمائی کرتی رہی۔ اس کی واضح مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کے منزل مقصود تک پہنچنے سے دی جاسکتی ہے۔

دین فطرت سے مراد ہرگز یہ نہیں کہ وہ کوئی علیحدہ مذہب و مسلک ہے، بلکہ یہ وہ عادتیں ہیں، وہ طریقے ہیں اور وہ روش ہے جو انسان کو روشن راہ کی طرف لے جاتی ہے جسے ہم مذہب کہہ سکتے ہیں۔ اسی میں اس کی ہر مشکل کا حل پوشیدہ ہوتا ہے۔ خواہ وہ انسانوں کے حقوق وفرائض کا تعین ہو، عبد و معبود کے درمیان جو نازک رشتہ ہے اس کی وضاحت ہو یا عبادات کا ایسا طریقہ ہو جو نہ صرف صفائے باطن کا ذریعہ بنے بلکہ ظاہری زندگی پر بھی اس کا اثر ہو۔ یہ مذہب ایسا ہو کہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اس کے اصولوں میں ترمیم وتنسیخ کی ضرورت نہ محسوس ہو، بلکہ ہر عہد میں اس

کے اصول قابل قبول ہوں۔ اگر غور سے تمام مذاہب کے اصولوں اور ان کے پیروکاروں کے موجودہ حالات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ ایسا مذہب اگر دنیا میں کوئی ہے تو وہ ''اسلام'' ہی ہے۔ یہی مذہب تمام انبیاء سلف کا مذہب تھا جسے میں نے دین فطرت کے نام سے متعارف کرایا۔ اللہ تعالیٰ نے خود ہی فرمایا ہے ''اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامِ'' (بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اگر کوئی مذہب ہے تو وہ اسلام ہی ہے) اس حوالہ سے یہ بات بھی صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ دنیا میں جتنے انبیاء آئے انہوں نے اسلام ہی کے اصول کی تبلیغ و اشاعت بھی کی اور اسی پر چلتے بھی رہے۔ اور جب جب ان اصولوں کے ماننے والے ان سے منحرف ہوئے اور اللہ کی رسی کو انہوں نے چھوڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے پھر سے نئے نبی یا پیغمبر یا مصلح کو دنیا کے حالات کو سدھارنے، سنوارنے اور اللہ تعالیٰ سے عام لوگوں کو جوڑنے کے لئے بھیجے جو انہیں مذہب اسلام کی طرف یا فطری مذہب کی طرف بلاتے رہے۔

مذہب کا اصل الاصول معبود حقیقی کا ٹھوس تصور ہے۔ مذاہب عالم کی تاریخ میں اس بات کا ثبوت موجود ہے۔ دیگر مذاہب میں بھی وحدانیت کا تصور مختلف شکلوں میں ملتا ہے گرچہ اس کے پیروکار اس کی شکل کو بگاڑ کر خدائے واحد کا شریک دوسروں کو بنانے لگے ہیں۔ وحدانیت کا یہ تصور ''نیتی نیتی'' (نہیں ہے نہیں ہے) کے اصول سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ صوفیا نے ہمہ اوست کا اصول بھی ہندو اپنشدوں کے اسی قول سے اخذ کیا ہے۔

بودھ مذہب کے بانی گوتم بودھ نے اس مسئلہ پر خاموشی اختیار کر رکھی ہے وہ عالم وجود کا سبب ''مادہ'' کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہاں بھی وحدانیت سے الگ کوئی بات نہیں ملتی۔ یہ بات الگ ہے کہ ان کے ماننے والوں نے انہی کی ذات کو الوہیت کا درجہ دے دیا۔

آتش پرست بھی معبود حقیقی کو یکتا و یگانہ تصور کرتے ہیں لیکن آگ کو اس

کے نور کا پرتو مان کر اس کی پرستش کرتے ہیں، یہیں سے اس مذہب کے اصول میں شرک شامل ہوتا ہے۔

یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول تصور کرتے ہیں اور ان کے یہاں معبود کا تصور شرک سے پاک تھا لیکن حضرت عزیر علیہ السلام کو جب اللہ کا بیٹا کہنے لگے تو یہ عقیدہ بھی پاش پاش ہو گیا۔

عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا اور حضرت مریم کو اللہ کی بیوی (نعوذ باللہ) کہنے لگے اور اس طرح اللہ کی ذات میں تثلیث کے قائل ہوئے۔ احادیث میں آیا ہے کہ ایک بار مدینہ منورہ میں ایک عیسائی رہنما سے نبی کریم ﷺ نے مسئلہ الوہیت سے متعلق انجیل مقدس کی کچھ آیتیں پڑھنے کو کہا۔ اس نے مسئلہ توحید سے متعلق جو آیتیں تھیں انہیں اپنے ہاتھوں سے چھپا کر بقیہ حصہ پڑھ دیا۔ لیکن آپؐ نے انہیں آیتوں پر انگلی رکھ کر پھر سے پڑھنے کو کہا۔ اس نے لاچار انہیں پڑھ کر سنایا جس سے یہ بات واضح ہوئی کہ عیسائیوں نے اللہ کی کتاب انجیل مقدس میں اپنی مرضی سے کچھ باتیں شامل کر دی ہیں انہیں میں مسئلہ تثلیث بھی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور روح القدس کو اللہ کا شریک مانتے ہیں حالانکہ قرآن کریم نے اس کی کھلم کھلا نفی کی ہے۔ جس کا ثبوت ہمیں سورۂ اخلاص سے ملتا ہے۔

(آپ کہہ دیجئے اے محمد ﷺ کہ اللہ ایک ہے وہ پاک و برگزیدہ ہے، نہ اسے کسی نے جنا اور نہ اس سے کوئی جنا گیا ہے اور نہ کسی خاندان یا قبیلہ سے اس کا کوئی تعلق ہے)

اسلامی عقائد کی رو سے خدا کی وحدانیت کا اقرار تمام اعمال میں اولیت کا حامل ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس کے بغیر کوئی شخص حلقہ بگوش اسلام ہو ہی نہیں سکتا ہے تو یہ غلط نہ ہوگا۔ تمام اعمال اور ارکان کا درجہ وحدانیت کے اقرار و ایمان باللہ کے بعد ہی آتا ہے۔ بے شمار آیتیں اس سلسلہ میں کلام پاک کی زینت ہیں۔

سورۂ لقمان میں حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جو وصیت کی ہے اس میں وحدانیت الٰہی بھی شامل ہے۔ یابنی لا تشرک باللہ ان الشرک لظلم عظیم (اے میرے بیٹے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرا اس لئے کہ شرک سب سے بڑا ظلم ہے)

قرآن حکیم نے مسئلہ توحید پر بڑے ٹھوس انداز میں منطقی دلیل بھی پیش کی ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ ایک سے زیادہ معبود کا وجود نہ صرف نقلی طور پر بلکہ عقلی طریقہ استدلال کے مطابق بھی نہیں ہے۔

لو کان فیھما آلھۃ الا اللہ لفسدتا (اگر زمین و آسمان میں ایک سے زیادہ معبود ہوتے تو اس کا نظام درہم برہم ہو جاتا)

تفصیل سے اسے اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر دو معبود ہوتے تو دونوں میں اتحاد و اتفاق ناممکن ہوتا کسی نہ کسی مسئلہ پر اختلاف ضرور ہوتا۔ کوئی کہتا کہ آفتاب مغرب سے طلوع ہو تو دوسرا اس سے اختلاف کرتا۔ کوئی رات اور دن کا قائل نہ ہوتا۔ ہمیشہ دنیا کو روشن رکھنے پر مصر ہوتا اور اس کے نتیجہ میں یہ دنیا اور سارا عالم تہہ و بالا ہو جاتا۔ کوئی چیز اپنی جگہ پر نہ رہ پاتی۔ اس وقت جو نظام عالم برقرار ہے اس کا کہیں وجود نہ ہوتا۔ اور انسان کی ترقی کی جو راہیں کھلی ہیں وہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ نظام عالم کو چلانے والا اسے سجانے اور سنوارنے والا اور اسے موجودہ حالت میں قائم رکھنے والا اگر کوئی ہے تو وہ خدائے واحد ہی ہے۔

ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو (وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں)

وحدانیت کے اس تصور سے قدم آگے بڑھایئے تو اقرار رسالت کی منزل آتی ہے۔ کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا زبان سے اقرار اور اس پر دل سے ایمان لانا مسلمان ہونے کی شرط اولین ہے۔

وھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق (اسی اللہ نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ سورۂ فتح)

وھو الذی بعث فی الامیین رسول منھم (وہی اللہ ہے جس نے امیوں میں سے ان میں سے ایک رسول بھیجا۔ (سورۂ جمعہ)

اس کے علاوہ حکم خداوندی: یا ایھا الذین آمنوا آمنوا باللہ و رسولہ بھی اقرار رسالت کا کھلا ثبوت اور اس کی تائید ہے۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ذات باری تعالیٰ تک رہنمائی اگر ہوئی ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت ہی سے ہوئی ہے۔ وہی ہمیں راہ حق پر چلنے اور خدائے واحد کی عبادت، معرفت اور عظمت کا احساس دلاتے ہیں اور اس لئے ان کے وجود کا بحیثیت رسول اقرار لازمی اور ضروری ہے۔ اس سے آگے مذہب اسلام کے بنیادی عناصر میں ایمان بالغیب کو بھی شامل کیا گیا ہے جس کے ماتحت مبدأ و معاد، قضا و قدر، فرشتوں کے وجود کا اقرار اور آخرت کے سارے معاملات آتے ہیں۔ اجمالی طور پر اسے اس طرح بیان کیا گیا ہے:

آمنت باللہ وملا ئکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الآخر والقدر خیرہ وشرہ والبعث بعد الموت (میں اللہ اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور آخرت کے دن اور تقدیر کی اچھائی اور برائی اور موت کے بعد زندہ ہو جانے پر ایمان لاتا ہوں)

خلاصہ یہ کہ اسلام کا یہ واضح اور بنیادی عقیدہ ہے۔ اس میں کوئی پھیر بدل نہیں۔ اس میں سادگی بھی ہے، حقانیت بھی اور اللہ تعالیٰ کی عبودیت کا اظہار بھی۔ اسلام کا آغاز اسی بنیادی عقیدے سے ہوا اور جب تک مسلمان اس راہ پر چلتے رہے سربلند و سرخرو رہے اور جب اس راہ سے بھٹکے تو آپس انتشار و اختلاف کا شکار ہو کر انہوں نے اپنی قدر و منزلت کھو دی۔

تاریخ شاہد ہے کہ دعوت حق کے نتیجہ میں جن مصائب و مشکلات کا سامنا نبی اکرم ﷺ کو کرنا پڑا اس کی مثال نہیں ملتی۔ اپنے لوگ، اپنا کنبہ، اپنے عزیز واقارب اور اپنے ہم وطن صرف اس لئے آپؐ کے دشمن ہو گئے کہ آپؐ نے حق و صداقت کا اعلان فرمایا اور یہ دشمنی اتنی بڑھی کہ آپؐ کو اپنے وطن کو خیر باد کہنا پڑا۔ مدینہ منورہ پہنچے تو سکون کی سانس لی لیکن کفار و مشرکین مکہ کو یہ بھی گوارہ نہ تھا۔ چند نام کے مسلمان ان کی سازش میں شریک ہوئے اور پھر مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوششیں شروع ہو گئیں کبھی جنگ کی شکل میں، کبھی مسلمانوں کے تجارتی قافلے پر حملہ کی شکل میں اور کبھی معاہدہ کر کے اسے توڑ دینے کی شکل میں۔ مدینہ منورہ میں اسلام کے غلبہ کی وجہ سے کھل کر مخالفت میں کوئی سامنے تو نہیں آیا، لیکن در پردہ جو لوگ اسلام کو اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے وہ منافق کے نام سے یاد کئے گئے۔ ان تمام اختلافات اور سازشوں کے باوجود اسلام کی اشاعت ہوتی رہی اور یہ مذہب پھلتا پھولتا رہا اور مسلمانوں کے قدم خطۂ عرب سے باہر نکلے تو دوسرے ممالک میں بھی اسلام کی توسیع و اشاعت کا آغاز ہوا۔

نبی کریم ﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد خلیفہ اول کی صورت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ جیسے ایک مدبر، ہوشمند، منتظم اور باعمل بزرگ نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالی۔ لیکن اسلام کی اس توسیع و اشاعت کے نتیجہ میں سازش کرنے والوں کی ایک اہم مخالفت منکرین زکوٰۃ کی شکل میں سامنے آئی، جسے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے مضبوط و مستحکم علم و عمل اور ارادہ کی بدولت ختم کر دیا۔ دوسرا مسئلہ بیرونی ممالک پر لشکر کشی کا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کے حکم سے اسلامی لشکر اشاعت اسلام کی غرض سے خطہ عرب سے باہر جا چکا تھا۔ اسی درمیان آپؐ کا وصال ہو گیا۔ اس موقع پر بعض اکابر صحابہ نے اس کا خدشہ ظاہر کیا کہ اس حادثہ کے بعد انتشار و اختلاف پیدا ہو سکتا ہے اس لئے فوج واپس بلا لی جائے۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ اٹل فیصلہ تھا کہ جس لشکر کو

نبی کریم ﷺ نے روانہ فرمایا اسے میں واپس نہیں بلاؤں گا۔ اور اس کا نتیجہ بھی برآمد ہوا۔ اسلام کی عظمت کا جو سکہ غیر ممالک اور مخالف و مشرکین کے دل میں بیٹھا تھا وہ برقرار رہا۔

حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے بعد حضرت عمر فاروق ؓ مسند خلافت پر متمکن ہوئے۔ ان کے دور میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ قائم رہا اور عوام کے فائدے کے لئے بے شمار اصلاحات کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ ملکی حدود کو بھی مضبوط کیا گیا۔ حضرت عمرؓ کی دیانتداری اور عدل و انصاف ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ تمام باتیں مخالفین، منافقین اور غیر مسلموں کے لئے باعث تشویش تھیں۔ اس لئے ان کی سازشیں بھی جاری رہیں، لیکن اب کھل کر سامنے آنے کی ان میں نہ ہمت تھی اور نہ حوصلہ۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے ایک پارسی غلام فیروز کے ذریعہ ان لوگوں نے حملہ کرانے کی سازش کی اور اس میں کامیاب رہے۔ حضرت عمر فاروق ؓ کو خنجر کے چھ زخم لگے جس کے نتیجہ میں یکم محرم الحرام ۲۴ھ کو آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

حضرت عمر فاروق ؓ کے بعد حضرت عثمان غنی ؓ کا دور خلافت ابتداء میں تو ٹھیک ڈھنگ سے چلتا رہا لیکن آپ کی نرم مزاجی نے دشمنان اسلام کے حوصلے اتنے بڑھا دیئے کہ وہ کھلم کھلا آپ کی مخالفت پر اتر آئے اور مسلمانوں میں اس طرح اختلاف پیدا کر دیا کہ بغاوت کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ ان سب سازشوں کا سرغنہ اس عہد کا سب سے بڑا منتفنی ایک یہودی تھا جو بظاہر مسلمان بنا ہوا تھا یعنی عبداللہ بن سبا۔ اس نے اپنی حکمت عملی کے ذریعہ اس اختلاف کو مزید ہوا دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے جس طرح فتنۂ ارتداد کو ختم کرنے کے لئے فوج کشی کی تھی اور جس مضبوط قوت ارادی کا مظاہرہ کیا تھا اس وقت اس کی ضرورت تھی۔ اکثر صحابہ نے فوجی کارروائی پر زور دیا لیکن حضرت عثمانؓ نے مدینۃ الرسولؐ میں خونریزی کا الزام اپنے سر لینے سے انکار کر دیا اور حالات بگڑتے رہے۔ انہوں نے صحابہ کے مشورہ سے مدینہ چھوڑ کر شام

چلے جانے یا مکہ کی طرف کوچ کر جانے سے بھی انکار کر دیا اور مدینہ میں ہی رہے، لیکن باغیوں نے ان کا جینا دوبھر کر دیا۔ وہ اپنے گھر میں قید ہو کر رہ گئے۔ پانی تک بند کر دیا گیا۔ ان کی حفاظت کے لئے حضرت علیؓ اور بعض دوسرے صحابہ نے اپنے لڑکوں کو ان کے گھر کی پہرہ داری پر مامور کر دیا لیکن اس کا بھی کچھ فائدہ نہ ہوا اور باغی پیچھے کی دیوار پھاند کر گھر میں گھس آئے اور انہیں شہید کر دیا۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو خلافت اسلامیہ کی کمزوری کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان صلح وصفائی کی کوششوں کو ایک طبقہ نے ماننے سے انکار کر دیا اور جنگ وجدال شروع کر دیا۔ یہ خارجی تھے جنہیں کچلنے کے لئے حضرت علیؓ کو فوجی کارروائی کرنی پڑی۔ اکابر صحابہ کے درمیان بھی غلط فہمیاں اتنی بڑھیں کہ جنگ جمل اور جنگ صفین کی معرکہ آرائی کی نوبت آ گئی لیکن اکابر صحابہ کی نیک نیتی اور صفائے قلب کی وجہ سے یہ مشکل مرحلہ بھی ٹل گیا۔

حضرت علیؓ کی خلافت اور حضرت امیر معاویہؓ کی مخالفت جاری ہی تھی کہ شرپسندوں نے حضرت علیؓ کو شہید کر ڈالا۔ حضرت امام حسن کی خلافت مسلمانوں کے درمیان پیدا شدہ اختلاف کو ختم کرنے کے لئے زیادہ دنوں تک نہ چلی اور انہوں نے حضرت معاویہؓ سے ایک معاہدہ کے تحت خلافت سے دستبرداری کا فیصلہ کر لیا اور ان کی خلافت کو تسلیم کر لیا۔ اس طرح سیاسی اختلافات کے ختم ہونے کی وجہ سے اسلامی فتوحات، نظم ونسق اور اصلاحات میں مزید بہتری ہوئی۔

دشمنان اسلام جنہیں یہ سب کسی حال میں بھی گوارہ نہ تھا، انہوں نے حضرت امیر معاویہؓ کے بعد حضرت امام حسینؓ کے ہاتھ پر فرضی بیعت کر کے انہیں دھوکا دیا اور ایسے حالات پیدا کئے کہ معرکہ کربلا کا سانحہ پیش آیا۔ جن لوگوں نے حضرت امام کا ساتھ دینے کی قسم کھائی تھی اور پھر انہیں دھوکہ دیا تھا، اس سانحہ کے بعد شہداء کربلا کے غم میں شریک نظر آئے۔ حقیقت میں یہ سب مصنوعی تھا اور اسلام اور مسلمانوں کے

خلاف جو سازشیں ابتدا سے ہوتی رہیں انہیں کا ایک حصہ تھا۔ یزید کے خلیفہ ہونے پر اتفاق نہ تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہیں سے خلافت راشدہ کا اختتام اور خاندانی حکومت کی داغ بیل پڑی۔ اور اس کی ابتدا امیر معاویہؓ نے یزید کو اپنا جانشین بنا کر کیا۔ جب کہ معاہدہ کے مطابق خلیفہ کا انتخاب صحابہ کبار اور امت کے معتبر لوگوں کے مشورہ سے ہونا تھا۔

امویوں کی خلافت میں عباسیوں نے خلافت کی دعوے داری اور حضرت امام حسینؓ کی شہادت کو ایک بہانہ بنا کر نیا فتنہ کھڑا کر دیا جس کے نتیجہ میں امویوں کی خلافت تو ختم ہوگئی اور عباسیوں کے ہاتھ میں حکومت وسلطنت کی باگ ڈور آگئی، لیکن عباسیوں نے خلافت پر قبضہ کرتے ہی بڑی بیدردی سے مسلمانوں کے خون بہائے، قتل عام کیا اور بڑے بڑے شہروں کو کھنڈر میں بدل دیا۔ اس کام میں انہیں ان علاقوں سے بھی خاص طور سے مدد ملی جو نئے نئے حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے اور جنہیں عربوں کی بالادستی اور برتری قبول نہ تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلام کی بلندی کے آگے تمام قدیم تہذیبوں کے مینار سرنگوں ہو گئے تھے۔ مصر، بابل، نینوا، روم اور ایران سبھوں نے اسلام کی عظمت کے آگے سر تو جھکا دیا تھا لیکن دل کے کسی گوشہ میں اپنی تہذیب کی برتری کا تصور لئے بیٹھے تھے اور یہی سبب مسلمانوں کے آپسی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر ابھر آئی۔ براہ راست حملہ نہیں ہوسکتا تھا اور اس کمزوری سے کسی دوسرے طور سے فائدہ بھی نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔ صرف ایک ہی شکل تھی کہ اسلامی عقائد پر چوٹ کی جائے اور بحث ومباحثہ، مناظرہ اور فلسفیانہ دلائل کے ذریعہ اسلامی اصولوں کو نشانہ بنایا جائے۔

عہد عباسیہ تک تاریخ اسلامی کے اس مختصر خاکے کو پیش کرنے کی غرض و غایت یہ ظاہر کرنا ہے کہ آغاز اسلام سے جو بھی مخالفتیں، سازشیں اور منافقتیں ہوتی رہیں ان سبھوں کی نوعیت سیاسی تھی۔ جب دشمنان اسلام نے دیکھا کہ جنگ وجدل، فوج کشی یا معرکہ آرائی سے مسلمانوں یا اسلام کو دبایا نہیں جا سکتا ہے اس کی توسیع و

اشاعت کو روکا نہیں جا سکتا ہے تو انہوں نے مسلمانوں کے اندر ہی ایسے اختلافات پیدا کئے اور ایسی سازشیں کیں کہ مسلمان کئی فرقوں میں تقسیم ہوتے چلے گئے۔اس طرح دیکھا جائے تو بنوامیہ کے عہد تک جو اسلامی مرکزیت، سادگی، عربی تہذیب، اصول خلافت اور اتحاد و اتفاق باقی تھا وہ بنوعباسیہ کے دور میں بالکل ہی ختم ہو گیا اور مکمل طور پر عجمی طرز حکومت آ گئی۔ دربار داری تھی، درباریوں کی خوشامد تھی اور بیرونی مداخلت کے اثرات تھے جو اسلامی اصولوں پر براہ راست حملہ آور ہو رہے تھے۔اس کے لئے فلسفیانہ موشگافیوں کا سہارا لیا گیا۔خدائے واحد کی وحدانیت، نبی کریم ﷺ کی رسالت اور ایمان بالغیب پر فلسفیانہ بحثیں شروع ہوئیں۔قول باری تعالیٰ ہے:

یا ایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ

(اے ایمان والو تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ)

یعنی نبی کریم ﷺ کے ذریعہ جو بھی تعلیم دی گئی اور جو اللہ کا حکم ہے اسے پوری طرح دل سے مانا جائے اور اس پر ایمان لایا جائے۔کہیں کسی شک و شبہ کا اظہار نہ کیا جائے۔یہی وجہ ہے کہ بعض مواقع پر صحابہ کبار قضا و قدر یا مبدا و معاد کے متعلق گفتگو کرتے دیکھے گئے تو حضرت رسالت مآب ﷺ نے انہیں روک دیا۔اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی اصول و عقائد کے سلسلہ میں کسی چون و چرا کی کوئی گنجائش نہیں۔جیسا ہے ویسا ہی تسلیم کرنا ہے۔ نہ اللہ کی وحدانیت کے لئے دلیل کی ضرورت ہے اور نہ رسول کی رسالت میں کسی شبہہ کی گنجائش ہے۔اسی طرح غیب سے متعلق جو علم کلام اللہ یا احادیث نبویؐ سے ثابت ہوتا ہے اس پر بھی کسی شک و شبہہ کا اثر نہیں پڑتا۔

جیسا کہ میں نے اوپر کی سطروں میں ذکر کیا، اسلام کے بنیادی عناصر تین ہیں توحید، رسالت اور ایمان بالغیب جس کے تحت آخرت، مبدا و معاد، ملائکہ اور قضاء و قدر بھی آتے ہیں۔انسانی طبائع اعتراف و اعتقاد کے سلسلہ میں مختلف واقع ہوئی

ہیں۔ بعض طبیعتیں اطاعت واتباع کی عادی ہیں اور آمنا وصدقنا یا سمعنا واطعنا کے حدود سے تجاوز نہیں کرتیں لیکن بعض طبیعتیں ایسی بھی ہیں جو تلاش وتحقیق اور تفحص کی خوگر ہوتی ہیں۔ وہ کیوں، کیسے اور کس طرح کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھاتیں۔ ہمیشہ چوں چرا میں پڑی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ وجود باری تعالیٰ کے لئے بھی انہیں دلائل و براہین کی تلاش ہوتی ہے۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

ان اختلافات میں خیالات اور حالات بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ عہد نبوت میں توحید ورسالت، حشر ونشر اور جزا وسزا کے مسائل پیش ہوئے تو جس طرح پیش ہوئے صحابہ نے انہیں اسی شکل میں بے چوں وچرا تسلیم کرلیا۔ مگر قرن اولیٰ کے بعد جب مختلف مذاہب اور مسالک کے لوگ اسلام کے دامن سے وابستہ ہونے لگے تو ان مسائل کی تفصیلات اور جزئیات پر بھی بحثیں شروع ہوئیں، جن پر تفصیلی بحث گزشتہ اوراق میں کی جاچکی ہے۔ چنانچہ انہیں امور کی بنا پر اسلام میں مختلف فرقے پیدا ہوتے چلے گئے۔ جب مسلمانوں کا واسطہ دوسرے مذاہب والوں اور خطہ عرب کے باہر کے ملکوں سے ہونے لگا تو اسلامی عقائد پر مخالفین اسلام کے مختلف اعتراضات کے مدلل اور مسکت جوابات کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور بحثیں شروع ہوئیں۔ یہی بحثیں جب بہت زیادہ بڑھیں اور ان میں فلسفیانہ رنگ آتا گیا تو انہیں ''علم کلام'' کا نام دیا گیا۔

فلسفی سر حقیقت نتوانست کشود
گشت راز دیگر آں راز کہ افشا می کرد

(مآخذ: تاریخ الامت۔ تاریخ اسلام۔
تاریخ طبری۔ الملل و النحل۔ مقدمہ ابن خلدون)

علم کلام کی تعریف

علامہ ابن خلدون نے علم کلام کی تعریف اس طرح کی ہے:

"ھو علم یتضمن الحجاج عن العقائد الایمانیۃ بالادلۃ العقلیۃ و الرد علی المبتدعۃ المؤمنین فی الاعتقادات من مذاھب السلف و اھل السنۃ و مرھذہ العقائد الایمانیۃ"

(مقدمہ ابن خلدون ۴۵۸)

(علم کلام کی تعریف یہ ہے کہ وہ عقائد اسلامیہ کو عقلی دلائل سے ثابت کرے اور مذاہب سلف واہل سنت کے مطابق اہل بدعت کے رد میں دلائل پر مشتمل ہو اور ان عقائد ایمانیہ کی اصل واساس توحید ہے۔)

علامہ ابن خلدون نے علم کلام کا مقصد یہ قرار دیا ہے کہ اسلامی عقائد کو عقلی دلائل کے ذریعہ اس طرح اثبات کیا جائے کہ بدعت اور ضلالت کی بیخ کنی اور شکوک وشبہات کا ازالہ ہوجائے۔

علم کلام کا موضوع

علم کلام کے موضوع پر ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں اس طرح روشنی ڈالی ہے:

فموضوع علم الکلام عند اھلہ انما ھو العقائد الایمانیۃ

بعد فرضها صحيحه من الشرع من حيث يمكن ان يستدل عليها بالادلة العقليه (ايضا ص ۴٦٦)

متکلمین کے نزدیک علم کلام کا موضوع وہ عقائد ایمانیہ ہیں جن کو شرعی طور پر صحیح تسلیم کر لینے کے بعد عقلی دلیل کے ذریعہ انہیں صحیح ثابت کیا جا سکے۔

علامہ شہرستانی علم کلام کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دین دو حصوں میں منقسم ہے۔ معرفت و طاعت۔ معرفت اصل ہے اور طاعت اس کی فرع۔ جس نے معرفت اور توحید کے مسائل پر گفتگو کی وہ اصول کہلایا اور جس نے طاعت و شریعت سے بحث کی اسے فروعی کہا گیا اور یہی اصول علم کلام کا موضوع قرار پایا اور فروع کو علم فقہ کا موضوع قرار دیا گیا۔

علامہ موصوف نے اصول کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے

قال بعض المتکلمین الاصول معرفة الباری تعالی بوحدانیته و صفاته و معرفة الرسل بایاتهم وبیناتهم و بالجملة کل مسئلة یتعین الحق فیها بین المتخاصمین فهی من الاصول (الملل والنحل ج ا ص ۵۱)

بعض متکلمین نے اصول کی تعریف یہ کی ہے کہ باری تعالیٰ کی وحدانیت و صفات اور حضرات انبیاء علیہم السلام کو ان کے معجزات اور دلائل سے پہچان لیا جائے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس مسئلہ میں جو دو فریقوں کے درمیان اختلافی ہوں جن دلائل کے ذریعہ حق کو واضح اور متعین کیا جا سکے وہی اصول قرار پائیں گے۔

پھر آگے چل کر انہوں نے اصول کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے

کل ما هو معقول ویتوصل الیه بالنظر والاستدلال فهو من الاصول و کل ماهو یظنون و یتوصل الیه بالقیاس والا جتهاد فهو من الفروع (الملل والنحل ج ا ص ۵۱) (ہر وہ مسئلہ جو عقلی ہو وہ اصول ہوگا۔ اور ہر وہ مسئلہ جو ظنی ہو اور اس کا حصول قیاس واجتہاد کے ذریعہ ہو وہ فروعی ہوگا۔)

ابتدا میں ان مسائل کے مباحث کو علم الاصول اور علم التوحید کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ پھر جب مسائل فقہیہ کے لئے "الفقہ فی العلم" کی اصطلاح رائج ہوئی تو کلامی مباحث کو "الفقہ فی الدین" کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ چنانچہ شہرستانی نے علم الاصول (علم کلام) کی فضیلت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

الفقہ فی الدین افضل من الفقہ فی العلم (دین کی سمجھ علم کی سمجھ سے کہیں بہتر ہے) (المنیۃ الامال فی شرح الملل و النحل ص ۳۱/۳۲ تاریخ ادبیات ایران ص ۸۱- انسائکلو پیڈیا آف اسلام ص ۶۷۲)

یہی سبب ہے کہ امام اعظم حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے عقائد سے متعلق جو رسالہ تحریر فرمایا اس کا نام "الفقہ الاکبر" رکھا۔

اگرچہ علم کلام کے موضوع پر تصنیفات کا سلسلہ عہد عباسیہ کے آغاز ہی سے شروع ہو گیا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ فن عہد مامون سے قبل علم کلام کے نام سے موسوم نہ تھا چنانچہ الملل و النحل میں شہرستانی نے اس کی تفصیل یوں درج کی ہے۔ ثم طالع بعد ذالک شیوخ المعتزلۃ کتب الفلاسفۃ حین فسرت ایام المامون مخلطت مناھجھا بمناھج الکلام و افردتھا فنامن فنون العلم و سمتھا باسم الکلام (الملل و النحل ص ۳۲)

(بعد ازاں جب عہد مامون میں فلاسفہ کی کتابوں کی اشاعت ہوئی اور علماء معتزلہ نے ان کا مطالعہ کیا تو فلسفہ کے مسائل کو علم کلام سے مخلوط کر دیا اور اسے ایک مستقل فن کی حیثیت دے دی جس کا نام علم کلام رکھ دیا گیا۔)

علم کلام کی وجہ تسمیہ

علم کلام کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف اقوال ملتے ہیں۔ عام طور پر یہ کہا جاتا

ہے کہ سب سے پہلا اختلاف جو امت مسلمہ کے اندر عقائد کے سلسلے میں پیدا ہوا وہ کلام نفسی (قرآن پاک) سے تعلق رکھتا تھا۔ اسی مناسبت سے اس علم کو علم کلام کہا گیا۔ علامہ شبلی نے مشہور مؤرخ ابن خلکان کے حوالے سے اس قول کو نقل کرنے کے بعد اس کی تردید کر دی ہے اور کہا کہ یہ غلط ہے کہ سب سے پہلا کلامی اختلاف کلام الٰہی کی نسبت پیدا ہوا (علم الکلام ص ۳۲)

آئندہ سطروں میں علم کلام کی ابتدا اور تدریجی ارتقا سے بحث کرتے ہوئے اس پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے گی۔

علامہ ابن خلدون اور شہرستانی نے کلام الٰہی کو وجہ تسمیہ قرار دینے کے متعلق ایک ہی خیال کا اظہار کیا ہے۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

واما لان سبب وضعه و الخوض فيه هو تنازعهم فى اثبات الكلام النفسى. (یا اس کی وجہ تسمیہ یہ ہو کہ اس کی ابتدا اور اس میں انہماک کا سبب وہ اختلاف اور مناقشات ہیں جو کلام نفسی کے سلسلہ میں ہوئے ہیں۔) [مقدمہ ابن خلدون ص ۴۶۵]

اس سلسلہ میں علامہ شہرستانی یوں رقم طراز ہیں:

امالان اظهر مسئله فكلموا فيها و تقاتلوا عليها هى مسئله الكلام فسمى النوع باسمها. (یا اس کی وجہ تسمیہ یہ ہو کہ سب سے اہم مسئلہ جس کے متعلق مباحث و مناقشات پیش آئے وہ کلام نفسی کا مسئلہ تھا۔ اسی مناسبت سے اس کا نام علم کلام رکھ دیا گیا۔) (الملل و النحل ص ۳۱/۳۲)

ابن خلدون نے اس سلسلہ میں ایک دوسرا خیال بھی یوں ظاہر کیا ہے:

امالما فيه من المناظرة على البدعت وهى كلام صرف وليست مراجعة الى عمل - (چونکہ اس میں عقائد کے متعلق اہل بدعت کے خلاف مباحث اور مناظرے ہوتے ہیں اور یہ بے سود کلام ہے اور نتیجہ کے طور پر کسی عمل کی طرف نہیں لے جاتا اس لئے اس کو کلام کہا گیا۔ (ابن خلدون ص ۴۶۵)

علامہ شہرستانی نے بھی اسی طرح ایک دوسرے خیال کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

واما لمقابلتهم الفلاسنة فی تسمیتهم فنا من فنون علمهم بالمنطق و المنطق و الکلام مترادفان - دینی بحث ومباحثہ کے سلسلہ میں اس علم کلام کا طریقہ استدلال ان فلسفیانہ طریق استدلال سے بڑی مشابہت رکھتا ہے جو فلسفہ کی شاخ منطق سے متعلق ہے اور منطق اور کلام دونوں ایک دوسرے کے ہم معنیٰ ہیں(**الملل و النحل ص۳۱/۳۲**)

علامہ تفتازانی نے شرح عقائد نسفی میں مختلف وجوہ بیان کئے ہیں جن میں سے ایک خاص اور اہم وجہ یہ ہے:

وسموا مایفید--معرفة العقائد عن ادلتها التفصیلیة بالکلام - (اور تفصیل دلائل کے ساتھ معرفت عقائد کا نام کلام رکھا گیا ہے)[شرح عقائد نسفی ص۵]

علامہ شبلی نعمانی نے اسی خیال کو سب سے زیادہ صحیح مانا ہے۔''تاریخ ادبیات ایران'' میں ایک اور قول نقل کیا گیا ہے لیکن اس قول کو کہاں سے لیا گیا اس کا کوئی حوالہ موجود نہیں ہے۔قول اس طرح ہے:

چونکہ اس فن کے حامیوں نے ان مسائل پر کلام کیا جن پر اسلاف نے سکوت پسند کیا تھا اسی لئے اسے کلام کہا گیا (ادبیات ایران ص۱/۸۱)

علم کلام کی ابتدا اور ترقی کے اسباب

اہل عرب خیالی اور تصوراتی دنیا میں نہیں رہتے تھے۔ علم و عمل پر ان کا پورا زور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عرب کا بچہ بچہ شعر و شاعری کی زبان سے واقف تھا اور اہل عرب کے علم و ادب کی سارے زمانے میں دھوم تھی۔ اسلام کے آغاز کے ساتھ اس کے ابتدائی دور میں صرف عملی امور اور احکامات مثلاً نماز، روزہ وغیرہ کے متعلق تحقیق و تفتیش کا سلسلہ شروع ہوا۔ فقہی مسائل کا اچھا خاصہ مواد عہد صحابہ ہی میں جمع ہو گیا تھا لیکن عقائد سے متعلق اجمالی عقیدہ ہی ان کے لئے کافی تھا۔ اور اس سلسلہ میں انہوں نے تحقیق و تفتیش کی ضرورت بھی نہیں سمجھی اس لئے کہ انہیں بتایا گیا کہ ''اسلام سے مراد حکم خداوندی اور فرمان نبوی کی اتباع اور اپنے آپ کو پوری طرح اس کے اصول و ضوابط کے ماتحت کر دینا ہے۔ خود سپردگی ہی اسلام کی روح ہے۔ بال کی کھال نکالنا بے چون و چرا سب کچھ تسلیم کر لینا ایک مسلمان کی شان ہے''۔ لیکن جب اسلام کی توسیع و اشاعت میں تیزی آئی اور دوسری قومیں بھی مسلمان ہونے لگیں تو عقائد کے متعلق نکتہ چینیاں اور معنی آفرینیاں شروع ہو گئیں۔ اس طرح عقائد کے اختلاف کی ابتدا ہوئی۔ علامہ شبلی نعمانی نے اختلاف کے اسباب پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے جس کا خلاصہ اس طرح ہے:

''نکتہ آفرینی اور نکتہ چینی عجمی قوموں کا مذاق تھا اور وہ بال کی کھال نکالنے کے عادی تھے۔ خصوصیت کے ساتھ جو لوگ یونانی فلسفہ سے متاثر تھے اور فلسفہ کی کتابوں کا مطالعہ کر چکے تھے ان کے لئے اسلام جیسے سیدھے اور سادہ مذہب میں بے شمار خامیاں نظر آئیں اور انہوں نے اپنے فلسفیانہ دلائل کو آلہ کار بنا کر اسلام پر اعتراض کی بوچھار شروع کر دی۔ پھر جب اسلام کو اللہ تعالیٰ نے پوری وسعت عطا فرمادی اور امن و اطمینان کا زمانہ آیا تو خلفاء بنو عباسیہ نے یونانی فلاسفہ کی کتابوں کا

ترجمہ کرانا شروع کیا جس سے مسلمان بہت زیادہ متاثر ہوئے اور انہوں نے بھی اسلام کے عقائد پر لب کشائی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس طرح رفتہ رفتہ ایسے اسباب پیدا ہوتے چلے گئے کہ علم کلام کا وجود ناگزیر بن گیا'' (علم کلام)

شہرستانی نے بھی اسباب اختلاف پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے انداز میں اس طرح خامہ فرسائی کی ہے:

''جب مسلمان فتوحات سے فارغ ہوئے اور ان کی توجہ علم وفن کی طرف ہوئی اور فلسفیانہ مباحث پر تراجم وتصنیفات کا سلسلہ شروع ہوا تو دینی عقائد کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ مباحث کا اختلاط بھی لازمی ہوگیا'' (الملل و النحل ص ۳۲)

بعض اختلافات ابتداء سیاسی بنیاد پر شروع ہوئے اور اسلام ان کا شکار اپنے آغاز سے ہی رہا۔ لیکن یہی سیاسی اختلافات جب مستقل حیثیت اختیار کر گئے تو ان میں کلامی مباحث کے امتزاج سے نئے نئے فرقے ظہور میں آتے چلے گئے، جیسے فرقہ شیعہ اور خوارج

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

عہد صحابہ میں اصول دین کے متعلق کوئی اختلاف نہیں تھا۔ عدل وتوحید، وعد وعید اور اس قسم کے تمام مسائل میں وہ متفق الخیال تھے۔ البتہ فقہ کے فروعی مسائل میں ان کے درمیان کچھ اختلافات ضرور تھے، لیکن ان کا یہ اختلاف آپس میں کا فرقہ یا فرقہ بندی کا کام انجام نہیں دیتا تھا۔

حضرت عثمانؓ کے خلافت کے آخری دور میں جو خانہ جنگیاں شروع ہوئیں ان سے چند نئے نئے مسائل پیدا ہوئے اور ان پر غور وخوض کی ضرورت محسوس کی جانے لگی مثلاً اصحاب جمل اور اصحاب صفین میں سے کون حق پر تھا اور جو حق پر نہیں تھا اس کا کیا حشر ہوگا؟ پھر خوارج نے مسئلہ تحکیم (حکم) کا ایک نیا شوشہ چھوڑا اور مختلف گروہوں نے ان وقتی مسائل کو بنیادی مسئلہ کی حیثیت دے دی۔ ان پر عقلی اور نقلی

دلائل کے ساتھ بحث بھی شروع ہوگئی۔ اس طرح علم کلام کے لئے زمین ہموار ہونے لگی جس کی بنیاد ہی اسلام میں فرقہ بندی اور باہمی اختلافات سے پڑی تھی اور اس کا مقصد اسلام کی توسیع و اشاعت پر روک لگانا اور مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکنا تھا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز   چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی

چنانچہ پہلی صدی کے ربع آخر میں مباحثہ ومناظرہ کا دروازہ کھل جاتا ہے اور علم کلام کے لئے زمین ہموار ہو جاتی ہے۔ بیشمار نئے نئے مسائل سامنے آتے جاتے ہیں۔ اس عہد میں حضرت حسن بصریؒ کی ہستی اس اعتبار سے ممتاز نظر آتی ہے کہ جن اہم شخصیتوں نے علم کلام کی داغ بیل ڈالی وہ ان کے حلقۂ درس سے متعلق رہے ہیں۔

عہد اموی میں جب خلافت اسلامیہ نے سادگی، بے ریائی اور عقائد کی پختگی کے بجائے ملوکیت کا لباس پہن لیا تو شخصی حکومت کے سارے نقصانات ظاہر ہونے لگے۔ ظلم واستبداد کی کارفرمائیاں شروع ہوئیں اور عام طور پر حکومت کے خلاف نکتہ چینیوں کے مواقع پیدا ہوتے چلے گئے۔ لیکن جبر و استبداد اور ظلم وستم کی گرم بازاری کے باعث زبانوں پر تالے لگے ہوئے تھے۔ ایسے ہی حالات میں سب سے پہلے معبد جہنی نام کا ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اس خیال کی تردید کی کہ سارے مظالم کو صبر وشکر کے ساتھ برداشت کر لینا چاہئے، اس لئے کہ قضا وقدر کے آگے کسی کی نہیں چلتی اور انسان مجبور محض ہے۔ ان خیالات کے اظہار کے ساتھ اس نے علانیہ بغاوت کر دی اور اس کی پاداش میں اسے جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

حضرت عثمانؓ کا ایک غلام غیلان دمشقی جو ایک واسطہ سے محمد بن حنفیہ کا شاگرد بھی تھا اس نے معبد جہنی کے بعد اس خیال کو ترقی دی کہ ''انسان اپنے فعل کا مختار کل ہے، اس میں مشیت کو کچھ دخل نہیں''۔ اور حضرت عمر بن عبد العزیز کو ایک خط لکھ کر اس نے بنی امیہ کے مظالم کی طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ شاہی توشہ خانہ کے نیلام کی

خدمت اس کے سپرد کی گئی۔ غیلان دمشقی بر سر عام سامانوں کو نیلام کرتا جاتا تھا اور پکارتا جاتا تھا کہ "یہ وہ مال واسباب ہیں جو ظلم وستم سے حاصل کئے گئے ہیں"۔ لیکن ہشام بن عبد الملک نے بغاوت کے جرم میں اس کے ہاتھ پاؤں کٹوا ڈالے پھر بھی اس کی زبان کام کرتی رہی اور وہ اعلانیہ بنوامیہ کے ظلم وستم کے خلاف بغاوت کے الفاظ بلند کرتا رہا جس کے نتیجہ میں وہ مارا گیا۔

غیلان دمشقی کے بعد واصل بن عطا نے انہیں خیالات کا اعادہ کیا اور عقائد کے اختلافات کی بنیاد پر ایک اہم فرقہ "فرقہ معتزلہ" کی داغ بیل ڈالی۔ (الفرق بین الفرق ص ۹۷-۹۸) اسی دور میں جہم بن صفوان نے جبر کا عقیدہ پیش کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ "انسان مجبور محض ہے۔ اس کو اپنے فعل پر کچھ بھی قدرت حاصل نہیں ہے"۔ اس نے اپنے ان خیالات کا اظہار شہر ترمذ میں کیا اور بنوامیہ کے آخری عہد میں سالم بن احوز مازنی کے ہاتھوں مرو میں مارا گیا۔

واصل بن عطا نے بھی یہ خیال ظاہر کیا کہ "اس امت میں جو بھی فاسق ہوا وہ نہ مومن رہا نہ کافر"۔ اس نے فسق کو کفر وایمان کے درمیان کی ایک منزل قرار دیا۔ چنانچہ اسی بناء پر حسن بصریؒ نے اسے اپنی مجلس سے نکال دیا اور لوگ عام طور پر یہ کہنے لگے کہ **انهما اعتزلا قول الامة** - (ان دونوں نے امت کے متفقہ خیال سے علیحدگی اختیار کرلی۔) [الفرق بین الفرق ص ۹۸]

"دونوں" کہنے کی وجہ یہ ہوئی کہ انہیں عقائد وخیالات کی اتباع عمرو بن عبید نے بھی کی تھی اور انہیں بنیادوں پر فرقۂ معتزلہ کی بنیاد پڑی تھی۔

عہد عباسیہ میں ان مباحث نے ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کرلی جسے علم کلام یا علم الاصول سے یاد کیا جانے لگا۔ اور اس پر تصنیفات وتالیفات کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ دوسری زبانوں کی کتابوں کے ترجمے بھی کئے گئے اور اس عقیدے کو وسعت وطاقت ملی۔

علم کلام کا تدریجی ارتقاء

نقل کے ساتھ عقل اور روایت کے ساتھ درایت سے کام لینا عہد صحابہ ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ انسانی طبیعتیں چونکہ مختلف واقع ہوتی ہیں اس لئے بعض لوگ محض نقل و روایت پر ہی اکتفاء کر لیتے ہیں اور عقلی اعتبار سے جرح، تنقید اور بحث کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جو عقل کو بھی اس معاملہ میں بروئے کار لاتے ہیں۔ وہ ہر روایت کو درایت کی کسوٹی پر پہلے پرکھ لیتے ہیں تب کوئی قدم اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ عہد صحابہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابو درداءؓ اور حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ہستیاں اس حیثیت سے ممتاز نظر آتی ہیں۔ جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث ''زندوں کی آہ و بکا سے مردوں کو عذاب ہوتا ہے'' جب عائشہؓ نے سنی اور قرآن کی کسوٹی پر پرکھا تو یہ فرمایا کہ لاتزر وازرۃ وزر اخری (کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا) کی موجودگی میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک کے گناہ کا مواخذہ دوسرے سے کیا جائے۔

اسی طرح حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے اس قول کے بھی حدیث ہونے پر شبہہ ظاہر کیا کہ ''آگ سے پکی ہوئی چیز کھا لینے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے'' اور فرمایا کہ اگر ایسا ہوگا تو گرم پانی سے وضو کرنے کے بعد بھی وضو نہیں ہوگا۔

صحابہ کرام نے اس قسم کے مسائل پر عقلی روشنی بھی ڈالی اور ان کا گہرائی سے جائزہ بھی لیا لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے چونکہ وہ عقائد سے متعلق مسئلوں پر بحث کرنا ایمان کی کمزوری کی دلیل سمجھتے تھے اور بعض مسائل پر بحث و تمحیص سے متعلق خود احادیث میں ممانعت آئی ہے اس لئے وہ حتی الوسع ان اختلافی مسائل پر بحث سے گریز

کرتے تھے۔ ان میں سب سے اہم اور معرکۃ الآرا مسئلہ جبر وقدر کا ہے۔ جب اس قسم کے مسائل سامنے آجاتے تو ان میں حصہ لینا بھی ناگزیر ہوجاتا ہے، چنانچہ مرتضیٰ زیدی نے جہاں اصحاب عدل کے طبقات کا تعین کیا ہے وہیں طبقہ اولیٰ میں خلفاء اربعہ اور صحابہ کبار میں سے عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، ابودرداءؓ ابوذر غفاریؓ اور عبادہ بن صامتؓ کے اسماء گرامی درج کرتے ہوئے مسائل جبر وقدر سے متعلق اس عہد کے چند واقعات اور مباحث بھی حوالہ کے طور پر پیش کئے ہیں۔

طبقہ ثانی میں مرتضیٰ زیدی کے قول کے مطابق حضرت امام حسن وحسین، امام زین العابدین، امام محمد باقر، حضرت محمد بن حنفیہ، حضرت سعید بن المسیب، طاؤس، ابوالاسود، علقمہ، اسود، قاضی شریح وغیرہ کو اصحاب عدل میں خاص طور پر شمار کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

وقد زکرت اکالیمھم المتعلقة بالعدل فی کتب التاریخ -

اور عدل سے متعلق ان کے کلام یا باتوں کو تاریخ کی کتابوں میں لکھا گیا ہے۔

(المنیۃ الامل ص ۷ تا ۱۱)

اس سلسلہ میں مرتضیٰ زیدی نے حضرت امام حسن کا ایک پیغام بھی نقل کیا ہے جو انہوں نے اہل بصرہ کو بھیجا تھا اور جس میں خصوصیت کے ساتھ قضاء وقدر کا تذکرہ ہے۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں بھی ان مسائل پر گفتگو کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ قول ہے **من لم یؤمن باللہ وقضائہ و قدرہ فقد کفر** - جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے قضاء قدر پر ایمان نہیں لایا اس نے بلاشبہ کفر کیا۔

(المنیۃ الامل ص ۷ تا ۱۱)

عہد اموی

عقائد اسلامیہ کو سب سے پہلے عہد اموی ہی میں فلسفیانہ مباحث سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ ہوا کہ جب دوسرے مذاہب کے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو ان کے دینی عقائد اور فلسفیانہ خیالات ان سے مکمل طور پر چھوٹ گئے۔ اس کے علاوہ جو لوگ یہود و نصاریٰ میں سے مسلمان نہ ہو سکے ان کے اعتراضات اسلام پر بڑھنے لگے اور نو مسلم حضرات ان اعتراضات سے کچھ اتنے زیادہ پریشان ہوئے کہ علمائے حق کو ان کے مسکت جوابات کے لئے عقلی دلائل پر بھی توجہ کرنی پڑی۔ گرچہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ علم کلام کی باضابطہ تدوین و اشاعت عہد عباس ہی میں ہوئی مگر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ عہد اموی کو علم کلام سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہا۔ مامون سے قبل علم کلام کے اثرات ایوان خلافت تک پہنچ چکے تھے۔ یزید ابن ابوالولید، جو یزید الناقص کے نام سے مشہور ہے، نے اپنے باپ ولید کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ جنگ و جدال کی بھی نوبت آئی۔ اس موقع پر یزید کے حامیوں میں معتزلہ ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے۔ انہیں میں عمرو بن عبید بھی تھا۔ یزید نے اس جنگ میں فتح حاصل کی، باپ کو قتل کیا اور تخت شاہی پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح معتزلین کا تعلق ایوان خلافت سے براہ راست قائم ہوگیا۔

معتزلہ کے امام واصل بن عطا، عمرو بن عبید اور فرقہ قدریہ کے بانی معبد جہنی، صالح دمشقی، غیلان دمشقی اور یونس اسواری اور فرقہ جبریہ کے بانی جہم بن صفوان اور اہل سنت کے امام حضرت حسن بصریؒ اسی عہد سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت امام حسن بصریؒ کے متعلق مرتضیٰ زیدی لکھتے ہیں کہ ''انہوں نے حجاج بن یوسف کو ایک خط لکھا تھا جس میں مسئلہ قضا و قدر پر روشنی ڈالی تھی''۔ ان کے علاوہ تیسرے دور میں حضرت حسن مثنیٰ، عبداللہ بن حسن، نفس زکیہ، ابو ہاشم، عبداللہ بن محمد بن حنفیہ (استاذ واصل بن عطا) محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس وغیرہم کا تذکرہ بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔

عہد عباسی

خلیفہ منصور تقریباً بائیس سال تک مسند خلافت پر متمکن رہا۔ اپنی حکومت کے استحکام وانصرام کے ساتھ اس نے علوم وفنون کی ترویج واشاعت اور ترقی میں بھی کافی دلچسپی لی۔ آٹھ مختلف زبانوں کی علمی ومذہبی کتابوں کے ترجمے کرائے۔ اسی بناء پر مشاہیر علم وادب اور اہل فن اس کے دربار سے وابستہ رہے۔ ان میں خاص طور سے عبد اللہ بن المقفع، ابن ابی العرجاء، مطیع بن ایاس اور یحیٰی بن زیاد کے نام قابل ذکر ہیں۔ دیگر علوم وفنون کے ساتھ علم کلام کو بھی منصور کی سرپرستی کا فخر اس طرح سے حاصل ہے کہ امام المعتزلین عمرو بن عبید سے اس کے بہت ہی قریبی اور گہرے تعلقات تھے۔ منصور اس کے علم وتقویٰ سے کافی متاثر تھا۔ چنانچہ جب وہ مسند خلافت پر بیٹھا تو عمرو بن عبید سے اس نے نصیحت کی درخواست کی۔ عمرو بن عبید نے بڑے اچھے انداز اور عمدہ پیرائے میں منصور کو نصیحتیں کیں۔ منصور نے اس کی وفات پر مرثیہ کے چند اشعار بھی کہے، جن میں اس سے اپنی عقیدت، محبت اور کمال علمی کا اظہار کیا ہے۔

مہدی کو علم وفن سے دلچسپی ورثہ میں ملی تھی اس لئے جب اسلامی عقائد اور اصولوں پر اعتراضات اور شبہات کا زور بڑھا تو اس نے ان کے جوابات کے لئے علماء کو تیار کیا اور اسی کے حکم سے علم کلام پر تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوا۔ مسعودی لکھتے ہیں

وکان المھدی اول من امر الجدلین من اھل البحث من المتکلمین بتصنیف الکتاب علی الملحدین۔ خلیفہ مہدی وہ پہلا شخص ہے جس نے اصحاب تحقیق ومناظرہ اور متکلمین کو ملحدین کے خلاف کتاب لکھنے کا حکم دیا۔ (مروج الذہب مسعودی ج۴ ص ۳۱۵)

علم کلام کی وہ صنف جس کا تعلق باہمی اختلاف سے ہے اس پر منصور کے

دور ہی میں تصنیفات کی ابتدا ہو چکی تھی اور اس سلسلہ میں عمرو بن عبید اور واصل بن عطا کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ علامہ شبلی کی رائے میں ملحدین کے رد میں جو کتابیں علم کلام پر لکھی گئیں ان کا سہرا ابوالہذیل علاف کے سر ہے۔ اسی لئے اس کو علم کلام کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد علماء متکلمین نے یہود و نصاریٰ کے مذاہب سے متعلق پوری معلومات بھی حاصل کرنی شروع کر دیں اور ان کے عقائد و اصول پر بھی ان کی تفتیش اور تحقیق شروع ہوگئی۔ چنانچہ ''نظام'' کے متعلق مرتضٰی زیدی نے لکھا ہے کہ ''وہ جس طرح قرآن کا حافظ تھا اسی طرح انجیل مقدس بھی اس نے یاد کر رکھا تھا اور اس کی تفسیر پر بھی اس کی پوری نظر تھی''

غیر مسلموں نے بھی اسلامی عقائد و مسائل سے پوری طرح واقفیت حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لئے کہ ان کے اعتراضات کا جواب ان کے مذہب کے اصول اور عقائد سے واقفیت کے بغیر علمائے متکلمین اچھی طرح نہیں دے سکتے تھے۔ اس لئے دونوں فریق اپنے مذہب کی دعوت و مخالفت کے لئے ہتھیار سے پوری طرح لیس ہو کر میدان مناظرہ اور مباحثہ میں اترنے لگے۔ متکلمین کی اس جد و جہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کثیر جماعت اسلامی عقائد اور اصول سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگی۔ چنانچہ مرتضٰی زیدی نے لکھا ہے کہ صرف ابوالہذیل علاف کے ہاتھ پر تین ہزار سے زائد اشخاص مشرف بہ اسلام ہوئے۔

مجوسی، یہود اور نصاریٰ غرض کہ تمام دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو اس کے پورے مواقع حاصل تھے کہ وہ اپنے مذہب کی دعوت دیں، اشاعت دین کریں اور ان کی جو خوبیاں ہیں انہیں بیان کرتے ہوئے مذہب اسلام کے اصول و عقائد پر اعتراضات بھی کریں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں عقلی دلیلیں بھی پیش کی جاتی تھیں اور

مسلمانوں کو پوری طرح سے قائل کرنے کی بھی کوشش ہوتی تھی۔ محدثین اپنے کاموں میں مشغول تھے۔ انہیں دوسرے مذاہب سے پوری طرح واقفیت بھی نہ تھی اس لئے ان اعتراضات اور فلسفیانہ موشگافیوں کا جواب ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس کی صلاحیت اگر تھی تو صرف علماء متکلمین میں تھی اس لئے ہارون رشید نے اپنی خلافت کے ابتدائی دور میں مذہبی مناظروں کو ممنوع قرار دے دیا تھا اور علماء علم کلام کو قید و بند میں ڈال دیا تھا لیکن جب یہود و نصاریٰ کی طرف سے حملے تیز ہوئے اور اسلامی عقائد پر بحثیں شروع ہوئیں تو اس کے جواب کے لئے اسے اپنے طریقہ کار میں تبدیلی لانی پڑی اور علماء متکلمین کو آزادی نصیب ہوئی اور انہیں کھل کر کلامی بحث و مباحثہ میں شرکت کرنے اور اعتراضات کا جواب دینے کا بھی موقع ملا، چنانچہ ایک اہم واقعہ مرتضیٰ زیدی نے اپنی کتاب المنیۃ الامل میں درج کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

''سندھ کے بادشاہ نے ہارون رشید کو ایک خط لکھا تھا کہ تم لوگ بزور شمشیر فتح حاصل کر رہے ہو۔ اگر تمہارا مذہب دلائل و براہین کی بنیاد پر قائم ہے تو کسی ایسے شخص کو بھیجو جو مجھ سے مناظرہ اور مباحثہ کرے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ تم حق پر ہو تو میں تمہارا مذہب اختیار کرلوں گا اور اگر میں حق پر ہوں تو تمہیں میرا مذہب اختیار کرنا ہوگا۔ ہارون رشید نے اپنی جانب سے ایک قاضی کو اس کے پاس بھیجا۔ بادشاہ نے قاضی کا کھلے دل سے خیر مقدم کیا اور اپنی طرف سے مناظرہ کے لئے ایک مذہبی پیشوا کو مقرر کر دیا۔ اس نے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے پہلا سوال یہ کیا کہ ''کیا تمہارا معبود قادر مطلق ہے ؟'' قاضی صاحب نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر اس نے پوچھا ''کیا وہ اپنے ہی جیسے معبود کو پیدا کرنے پر قادر ہے ؟'' انہوں نے فرمایا کہ ''یہ مسئلہ علم کلام سے تعلق رکھتا ہے اور ہم اہل حق اور فقہاء اسلام اس فن کو پسند نہیں کرتے''۔ بادشاہ نے قاضی کو لوٹا دیا اور ہارون رشید کو پھر ایک خط لکھا کہ میں نے جس شبہہ کی بنیاد پر تمہیں خط لکھا تھا وہ تمہارے قاضی کے بیان کے بعد یقین میں بدل

گیا اور مناظرہ کا پورا واقعہ درج کر دیا۔ ہارون اس واقعہ سے بہت متاثر ہوا اور افسوس کرنے لگا۔ اس نے کہا ہمارے مذہب میں ایسے لوگ موجود نہیں جو اس کے اصول و عقائد کا دفاع کر سکیں۔ اس پر وہاں موجود لوگوں نے کہا کہ ''ایسے لوگ تو ہیں لیکن یہ وہی لوگ ہیں جنہیں آپ نے بحث و مناظرہ سے روک رکھا ہے اور ان کی ایک بڑی جماعت آپ کے حکم سے قید خانہ میں دن گزار رہی ہے''۔ ہارون نے ان تمام متکلمین کو اپنے سامنے بلوایا اور مذکورہ بالا مسئلہ کا حل دریافت کیا۔ ان میں سے ایک لڑکے نے اس مسئلہ کا حل یہ بتایا کہ ''سوال ہی بے محل ہے اس لئے کہ مخلوق بہر حال حادث ہوگا اور حادث قدیم کی طرح کس طرح ہو سکتا ہے ؟ یہ بات اسی طرح محال ہے جس طرح یہ کہا جائے کہ خدا اس پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ عاجز اور جاہل بن جائے (نعوذ باللہ)''۔

ہارون نے اس لڑکے کو مناظرہ کے لئے سندھ بھیجنے کا حکم صادر فرمایا۔ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا کہ ''پتہ نہیں وہاں کس کس طرح کے اعتراضات کئے جائیں اور سوالات پیدا کیے جائیں، ایک کم عمر لڑکا ان کا تشفی بخش جواب دے سکے یا نہیں، اس لئے اس پر پھر سے غور کیا جائے''۔ آخر کار معمر بن عباد کو اس خدمت کے لئے منتخب کیا گیا لیکن جب وہ سندھ کے قریب پہنچا تو وہاں کے علماء کو ہونے والے بحث و مباحثہ میں اس کی شرکت اپنی رسوائی کی شکل میں نظر آئی اور انہوں نے اسے راستہ ہی میں زہر دلوا کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بہر حال علم کلام پر جو پابندی اس وقت تک تھی وہ ختم ہوگئی اور علماء متکلمین کھل کر مذہب کے اصول و عقائد کے دفاع میں اٹھ کھڑے ہوئے۔''

مرتضی زیدی کا بیان کردہ یہ واقعہ علماء کلام کے اوپر جو پابندیاں تھیں اور پھر انہیں جس طرح آزادی نصیب ہوئی اس پر بہت واضح روشنی ڈالتا ہے اور علم کلام کے ذریعہ دین کے دفاع میں جو مدد ملی اسے بھی واضح کرتا ہے۔

برامکہ

برامکہ نے اپنے عہد اقتدار میں جس طرح علم وفن اور شعر و ادب کی سرپرستی کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ دوسرے علوم وفنون کی طرح علم کلام بھی ان کی توجہات کا مرکز رہا۔ مسعودی نے برامکہ کے تذکرہ کے ضمن میں یحیٰ بن خالد کے متعلق لکھا ہے کہ وہ صاحب علم وبصیرت اور صاحب بحث ونظر تھا۔ اوراس نے ایک مجلس مقرر کر رکھی تھی جس میں متکلمین اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کے متکلمین بھی شریک ہوتے تھے۔۔ مسعودی نے اس مجلس کے ایک خاص اجتماع کا تذکرہ کرتے ہوئے یحیٰ بن خالد کی ایک گفتگو اس طرح نقل کی ہے:

قد كثر ثم الكلام الكمون و الظهور و القدوم و الحدوث والا ثبات و النفى و الحركات و السكون و المماسة والمبائينة و الوجود و العدم و الجرد و التفرط و الاجسام والا عراض و التعديل و التجريح و نفى الصفات و اثباتها والا ستطاعة و الافعال و الكمية و الكيفية و المصاف والا مامة النفس هى ام اختيار وسائر ماتوردونه من الكلام فى الاصول و الفروع - تم لوگ زیادہ تر ظاہر وباطن، قدوم و حدوث، اثبات ونفی، حرکت وسکون، مماسۃ ومبائینہ، وجود وعدم، تجرید وتفریط، اجسام و اعراض، تعدیل وتجریح، نفی صفات واثبات، استطاعت وافعال، کمیت وکیفیت اور مسئلہ امامت اور کلام کے ہر نئے اور فروعی مسائل پر بحث کرتے ہو۔ (مروج الذہب ج ۲ ص ۳۷۹)

مندرجہ بالا عبارت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس طرح کی مجلسوں میں کن کن مباحث پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ اور یہی وہ مجلسیں ہیں جن کے متعلق عہد

الرزاق کانپوری نے البرامکہ میں یہ لکھا ہے: ''مامون رشید نے جس مسئلہ کو اپنے عہد خلافت میں ترقی دی وہ یحییٰ برمکی کی قائم کردہ ہے''

مسعودی نے ان مجلسوں میں شامل ہونے والے تیرہ علماء کی موجودگی کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ ان میں سے بعض نام یہ ہیں: علی بن ہشیم (متکلم شیعہ) ابومالک الحریری (خوارج) شیخ البصرئین محمد بن الہذیل العلاف (معتزلہ) ہشام بن حکم کوفی (شیخ الامامیہ) اور ابراہیم بن سیار (معتزل)

خاندان نوبخت

برامکہ کی طرح خاندان نوبخت نے بھی علم کلام کی ترقی میں خصوصی طور پر حصہ لیا جس طرح یحییٰ برمکی کے یہاں علم کلام کے موضوع پر مناظرہ اور مباحثہ کی مجلسیں ایک خاص ادارہ کے تحت منعقد ہوا کرتی تھیں اسی طرح اسماعیل نوبخت کے یہاں بھی علماء کلام کا خصوصی اجتماع ہوا کرتا تھا جس میں مختلف کلامی مسائل پر بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ اسماعیل نوبخت بھی علم کلام پر مہارت رکھتا تھا۔ مباحثہ میں حصہ لینے کے علاوہ اس کی چند کتابیں بھی علم کلام سے متعلق ملتی ہیں جن کے نام یہ ہیں: کتاب ابطال القیاس۔ نقض کتاب الحکمۃ عن الراوندی۔ نقض التاج علی الراوندی۔ کتاب تثبیت الرسالۃ۔

لیکن خاندان نوبخت کو شہرت اور عروج کی منزلوں تک پہنچانے والا اس کا ایک اہم فرد فضل بن نوبخت تھا جو خلیفہ ہارون رشید کے بیت الحکمۃ کا منتظم اور مہتمم تھا۔ اسی کی ذاتی صلاحیتوں اور علوم وفنون سے گہری دلچسپی رکھنے کی بدولت خاندان نوبخت سے لوگ روشناس ہوئے۔ اور اس کے بعد اس خاندان میں ایک سے ایک صاحب علم

وفن اور اہل کمال پیدا ہوتے رہے، جن میں اکثر و بیشتر نے علم کلام کی جانب خصوصی توجہ کی۔ اس سلسلہ میں فضل بن نوبخت کے پوتے اسماعیل نوبخت کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ اس نے بھی علم کلام کی ترویج و ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ پھر اسماعیل کے بھانجے حسن بن موسیٰ نے اپنے اسلاف کے نام کو مزید روشن کیا اور علم و ادب کی دل و جان سے خدمت کی۔ وہ نہ صرف یہ کہ علم کلام کا ماہر تھا بلکہ فلسفہ سے بھی اسے خصوصی شغف تھا۔ چنانچہ اس نے فلسفہ یونانی کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ بھی اپنی کوششوں اور اہتمام سے کرایا۔

علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ خزانة الحکمت وہ محکمہ تھا جس میں دنیا کی تمام علوم وفنون کی کتابیں ترجمہ کی جاتی تھیں لیکن دوسری کتابوں مثلاً البرامکہ وغیرہ میں خزانة الحکمت کی جگہ بیت الحکمت کا لفظ آیا ہے۔ نام کچھ بھی ہو غرض ایک ہی تھی یعنی مختلف علوم وفنون کی کتابوں کے ترجمے کا محکمہ جو بڑی لگن اور ہوش و گوش کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہا اور اس نے غیر مذاہب اور زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ کرانے کا جو سلسلہ شروع کیا اس کا اثر اسلامی علوم وفنون پر بہت دیرپا ثابت ہوا۔

مامون

خلیفہ مامون سے قبل کلامی مسئلوں پر مباحثہ اور مناظرہ کی گرم بازاری تو شروع ہو چکی تھی اور بعض رسائل بھی اس موضوع پر تصنیف ہو چکے تھے، لیکن علم کلام نے ایک باضابطہ فن کی حیثیت اختیار نہیں کی تھی۔ مامون کی علم دوستی کے سبب فلسفہ و حکمت کی کتابوں کے ترجمے کثرت سے ہونے لگے اور متکلمین بالخصوص معتزلین کو

مسائل فلسفہ سے واقفیت حاصل ہوئی تو علم کلام نے ایک نیا رنگ اختیار کر لیا اور اسے ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ شہرستانی لکھتے ہیں:

ثم طالع بعد ذالک شیخ المعتزلة کتب الفلاسفة حین فسرت ایام المامون فخلطت مناھجھا بمناھج الکلام و افردتھا فنا من فنون العلم وسمتھا باسم الکلام - بعد ازاں جب عہد مامون میں فلاسفہ کی کتابوں کی اشاعت ہوئی اور علماء معتزلہ نے ان کا مطالعہ کیا تو فلسفہ کے مسائل کو کلام کے مباحث سے مخلوط کر دیا اور اسے ایک مستقل فن کی حیثیت دے دی اور اس کا نام علم کلام رکھ دیا۔ (الملل و النحل ص ۳۲)

مسعودی نے قاہر باللہ کے دربار کے ایک حاضر باش محمد بن علی العبدی الخراسانی کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے جس میں قاہر باللہ کے حکم سے خلفائے عباسیہ کے حالات قلمبند کئے گئے تھے، جس میں مامون کا تذکرہ ان الفاظ میں ہوا ہے۔

''اسے کتب قدیمہ کے مطالعہ کا کافی شغف تھا اور انہیں سمجھنے کی پوری کوشش کرتا تھا۔ علماء کلام کی صحبت میں بیٹھتا اور اصحاب بحث و مناظرہ کو اپنے مقربین میں جگہ دیتا۔ انہیں میں ابو الہذیل اور نظام بھی تھے۔ ان دونوں کے علاوہ بہت موافق و مخالف عقائد رکھنے والے علماء اس کی مجلس میں شریک ہوتے تھے۔ اس نے دور دراز کے دیار و امصار سے فقہا اور ادباء کو بلا کر ان کے وظائف مقرر کئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ بحث و مناظرہ کی جانب راغب ہوئے اور اس کی تعلیم عام ہوئی۔ چنانچہ ہر گروہ نے اپنے مذہب کی تائید میں تصنیفات کا سلسلہ شروع کر دیا''

(مروج الذہب ج ۲ ص ۳۱۸)

مامون نے جو مجلس مناظرہ تشکیل دی تھی اس کی نشست ہر سہ شنبہ

(منگل) کو ہوا کرتی اور اس میں علماء وفقہاء وقت شریک ہوا کرتے۔ ایک آراستہ کمرے میں پہلے ان کے لئے دستر خوان بچھتا۔ پھر کھانا کھانے اور وضو کرنے کے بعد یہ لوگ عطر لگا کر مجلس مناظرہ میں شریک ہوتے۔ مامون عزت واحترام کے ساتھ انہیں اپنے قریب بٹھاتا۔ اس مجلس میں بڑی آزادی اور بے باکی کے ساتھ گفتگو ہوتی اور حاکمی اور محکومی کا فرق گفتگو کی آزادی میں قطعاً حائل نہ ہوتا۔ یہ سلسلہ دوپہر ڈھلے تک جاری رہتا۔

مامون محض علم کلام اور متکلمین کی سرپرستی ہی نہیں کرتا تھا بلکہ وہ خود بھی مباحث میں دلچسپی لیا کرتا تھا اور مختلف مواقع پر اس نے ملحدین یا دیگر مذاہب اور مختلف اسلامی فرقوں کے افراد سے مناظرانہ گفتگو بھی کی ہے۔ چنانچہ خطیب بغدادی نے ایک خارجی سے اس کی گفتگو کا ایک واقعہ اس طرح درج کیا ہے۔

''ایک خارجی مامون کے پاس لایا گیا۔ مامون نے پوچھا ''کس بنیاد پر تم ہماری مخالفت کرتے ہو؟'' اس نے کہا'' آیت قرآن کی بناء پر۔ مامون نے پوچھا وہ کون سی آیت ہے؟ خارجی نے آیت قرآنی **ومن لم یحکم بما انزل الله فاولئک هم الکافرون** – ترجمہ (اور جو شخص اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو وہ کافروں میں سے ہے) کی تلاوت کی۔ مامون نے کہا'' کیا تمہیں اس کا علم ہے کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ نے ہی نازل فرمائی ہے؟'' خارجی نے کہا'' بیشک''۔ مامون نے کہا'' تمہاری دلیل کیا ہے؟'' اس نے جواب دیا'' اجماع امت''۔ مامون نے جواب دیا'' جس طرح تم قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں اجماع کا سہارا لیتے ہو اسی طرح آیت کی تشریح میں بھی اس کی پیروی کیوں نہیں کرتے؟'' خارجی'' صدقت یا امیر المؤمنین والسلام علیک'' کہہ کر چلا گیا۔ (تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۱۸۶)

فتنہ خلق قرآن

علم وادب کی سرپرستی کی وجہ سے خلیفہ مامون الرشید کا نام بہت بلند ہوا۔ لیکن اس نے اس سلسلے میں جو کچھ بھی کیا اور جو بھی نام پیدا کیا ان تمام خوبیوں اور فضیلت پر اس وقت پانی پھر گیا جب اس نے خلق قرآن کے عقیدے کی حمایت اور اشاعت میں اپنے منصب کا ناجائز فائدہ اٹھا کر علماء حق اور فقہاء دین اور ائمہ مجتہدین پر ظلم وستم کی ابتدا کی اور اس عقیدے کو ماننے کے لئے سخت گیری پر اتر آیا۔ گرچہ اس فتنہ نے انتہائی سفاکی و بربریت کی شکل معتصم باللہ کے عہد میں اختیار کی لیکن اس کی بنیاد ڈالنے والا اور اس عقیدے کو ہوا دینے والا سب سے پہلا شخص مامون ہی تھا، جس نے ۲۱۲ھ میں تمام صحابہ پر حضرت علیؓ کی فضیلت اور افضل الناس بعد رسول اللہ ﷺ کے قول کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کی تخلیق کے عقیدے کا بھی اظہار کیا۔

۲۱۸ھ میں اس نے اسحاق بن ابراہیم کو خط لکھا کہ تمام قضاۃ شہود اور محدثین کا اس مسئلہ کے متعلق امتحان لیا جائے اور ان کے عقیدے سے واقفیت حاصل کی جائے، چنانچہ اس موقع پر جن لوگوں نے مامون کے عقیدے کی اتباع کر لی وہ محفوظ و مامون رہے اور جنہوں نے اس سے انکار کیا ان سے پہلے تو باضابطہ مناظرہ کا اہتمام کیا گیا اور اس کے بعد جو اپنے عقیدے پر اٹل رہے ان کی معاونت سے دربار خلافت نے دست کشی اختیار کر لی۔ اس کے بعد بغداد کے محدثین کا امتحان لیا گیا۔ مامون نے فقہاء واکابر دین وملت اور علماء مجتہدین سے بحث و مناظرے کے لئے اسحاق بن ابراہیم کو مامور کیا جس نے بے شمار علماء وفقہا وقت کو اس مسئلہ پر اپنے

عقیدے کے اظہار کے لئے مجبور کیا۔ان میں سے اکثر و بیشتر نے خلافت کے دباؤ میں آکر مامون کے عقیدے کا اعتراف کرلیا، لیکن چند ایسے بھی باہمت اہل دین اور بہادر فرزندان توحید تھے جو آخر وقت تک اپنے عقیدے پر جمے رہے۔اور انہوں نے کسی سختی کو بھی نگاہ میں نہ لایا۔ان عالی حوصلہ بزرگوں میں سے حضرت امام احمد بن حنبل، سجادۃ، قواریری اور محمد بن نوح مضروب کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ان کے استقلال اور ہمت وحوصلہ کا بدلہ انہیں یہ ملا کہ قید و بند کی صعوبتیں سہنی پڑیں اور پابند سلاسل کر دیا گیا۔ان پر بے انتہا مظالم کئے گئے۔اس کے نتیجے میں سجادۃ اور قواریری نے ہمت چھوڑ دی اور قید و بند کی سختیوں کی تاب نہ لاکر خلق قرآن کے قائل ہو گئے۔چنانچہ انہیں آزادی مل گئی۔لیکن امام احمد بن حنبل اور محمد بن نوح کو مقید کر کے طرسوس کی جانب روانہ کر دیا گیا۔اسی اثناء میں مامون کو یہ خبر ملی کہ علماء پر جبر وظلم کر کے ان سے خلق قرآن کا عقیدہ تسلیم کرایا گیا تو اس نے اسحاق بن ابراہیم کو یہ لکھ کہ جو لوگ دباؤ اور جبر کی وجہ سے خلق قرآن کے قائل ہوئے انہیں میری خدمت میں روانہ کرو۔اس کے نتیجہ میں درج ذیل علماء اور محدثین کو پابند سلاسل کر کے مامون کی خدمت میں بغداد روانہ کر دیا گیا۔

ابوحسان زیادی، بشیر ابن الولید، فضل بن غانم، علی بن مقاتل، ذیال بن ہشیم، یحیٰ بن عبدالرحمٰن عمری، علی بن جعد، ابوالعوام، سجادۃ، قواریری، ابن الحسن علی بن عاصم، اسحاق بن ابی اسرائیل، نضر بن شمیل، ابوالنصر التمار، سعدویہ الواسطی، محمد بن حاتم بن میمون، ابو معمر بن الہرش، ابن الفرخان، احمد بن شجاع اور ابوہاون بن بکاء۔

لیکن یہ لوگ ابھی راستہ ہی میں تھے کہ مامون نے فرشتہ اجل کو لبیک کہا اور انہیں بغداد واپس کر دیا گیا۔اس طرح چند دن ان کے سکون سے گزرے لیکن یہ

سکون واطمینان دیرپا ثابت نہ ہوا۔اس لئے کہ جب خلیفہ معتصم باللہ مسند خلافت پر متمکن ہوا تو اس نے اس مسئلہ خلق قرآن پر اور زیادہ شدت کا اظہار کیا۔تمام شہروں کے قضاۃ کو خاص طور پر خطوط لکھے گئے کہ خلق قرآن کے مسئلہ پر لوگوں کا امتحان لیا جائے۔تمام مدارس کے اساتذہ اور معلمین کو بھی یہ حکم دیا گیا کہ خلق قرآن کا مسئلہ طالب علموں کے ذہن میں بٹھایا جائے اور اس سلسلہ میں ان کے عقیدے میں پختگی لائی جائے۔جس شخص نے بھی اس حکم کو ماننے اور اس عقیدے کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اس پر بے انتہا مظالم کئے گئے۔چنانچہ حضرت امام احمد بن حنبل کو ۲۱۹ھ میں معتصم باللہ نے اپنے دربار میں طلب کر کے ان سے خلق قرآن کے مسئلہ سے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے واضح لفظوں میں اپنے عقیدے کا اظہار کیا اور قرآن کے مخلوق ہونے کے مسئلہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا،جس کے نتیجہ میں ان پر بے شمار کوڑے لگوائے گئے۔بار بار کوڑوں کی مار اور ان کی تکلیف سے وہ بیہوش ہو ہو جاتے۔پھر جب ہوش آتا تو یہی ستم ان پر جاری رہتا۔کوڑوں کی ضرب سے جلد پھٹ پھٹ گئی تھی۔ان کی اس تکلیف کو اور اس حالت کو دیکھ کر بھی اسے رحم نہ آیا اور ان کی رہائی کا حکم صادر نہیں ہوا بلکہ مقید کر کے رکھا گیا۔ان کے علاوہ بھی بے شمار علماء اس کے ہاتھوں اپنے عقیدے کی استقامت کے عوض قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا ہوئے اور ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے۔

معتصم کے بعد واثق باللہ کے ابتدائی دور میں یہ فتنہ اپنے پورے شباب پر رہا اور علماء حق کو طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔انہیں میں احمد بن نصر خزاعی بھی تھے جن کو واثق نے مسئلہ خلق قرآن کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے خود اپنے ہاتھوں سے قتل کیا اور ان کے جسم کو سر من رای میں اور سر کو بغداد کی شاہراہ عام پر لٹکوا دیا،

تاکہ لوگوں کو عبرت حاصل ہو اور اس عقیدے کے خلاف اپنی زبان نہ کھول سکیں۔ مزید برآں احمد بن نضر کے سر کے ساتھ یہ تحریریں آویزاں کردی گئیں کہ "یہ سر احمد بن نضر بن مالک کا ہے جس کو عبداللہ امام ہارون نے خلق قرآن اور انکار رویت باری تعالیٰ کے اقرار کی دعوت دی تھی لیکن اس نے انکار کیا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا ٹھکانہ جہنم میں بنادیا"

لیکن یہ سختی واثق کے عہد میں زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی اور ابوعبدالرحمن عبداللہ بن محمد ازدی نے اپنے دلائل سے اسے کچھ اس طرح قائل کیا کہ علماء اور فقہاء پر سے اس نے پابندی اٹھالی۔ اور قرآن کو مخلوق ماننے اور نہ ماننے کا جھگڑا بالکل ہی ختم ہو گیا۔ (یہ واقعہ انشاء اللہ واثق کے عہد سلطنت کے سلسلہ میں تفصیل سے آئے گا)

معتصم اور علم کلام

خلیفہ معتصم باللہ زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا بلکہ اسے ایک حد تک جاہل مطلق کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ سپاہیانہ ذوق رکھتا تھا اس لئے اس کے دور میں علمی مباحثوں کی گرم بازاری نہ رہی، لیکن عقائد میں وہ اپنے بھائی کا پیرو تھا اس لئے اس میدان میں بھی اس نے علمی ذوق اور ادب وتہذیب کی بجائے سپاہیانہ سختی اور قوت کا مظاہرہ کیا۔ مامون کے عہد میں جس آزادی اور بے باکی کے ساتھ مختلف العقائد افراد کو اپنے خیالات کے اظہار کا موقع میسر تھا معتصم نے اس کے دروازے بالکل بند کر دئے اور جبر وتشدد کے ذریعہ اپنے عقائد کی اشاعت کا کام تیزی کے ساتھ جاری رکھا جس کے براہ راست نشانہ حضرت امام احمد بن حنبل اور دیگر بے شمار فقہاء ومحدثین بنے۔

واثق باللہ

جب معتصم باللہ کا بیٹا واثق باللہ مسند خلافت پر بیٹھا تو اس نے مامون کی علمی مجلسوں کو پھر سے زندہ کر دیا۔ وہ خود ذی علم تھا اور بحث و مناظرے کا خوگر۔ تقلید سے نفرت کرتا تھا۔ قدیم و جدید فلاسفہ اور حکماء اور اطباء کے علوم سے واقفیت حاصل کرنے کا اسے بہت شوق تھا۔ اس کی مجلس میں طبعیات اور الہیات کے مختلف مباحث زیر بحث رہا کرتے۔ چنانچہ مسعودی نے "مروج الذہب" میں لکھا ہے۔

واثق نے بھی ایک علمی ادارہ قائم کر رکھا تھا جس کے تحت فقہاء و متکلمین کے درمیان علوم عقلیہ و نقلیہ کے اصول و فروع زیر بحث آتے اور مختلف مباحث پر بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہتی۔ مسعودی نے مہدی باللہ کے حوالہ سے واثق کے دربار کا ایک خاص واقعہ اس طرح لکھا ہے:

شام کے سرحدی علاقوں کے ایک شیخ الحدیث اور فقیہ واثق کے دربار میں گرفتار کر کے لائے گئے۔ ان کے متعلق سیوطی نے لکھا ہے کہ یہ ابوداؤد اور نسائی کے استاذ ابوعبد الرحمن عبد اللہ بن محمد ازدی تھے، جن سے گفتگو کا واقعہ حوالہ کے طور پر مسئلہ خلق قرآن کے سلسلہ میں گزر چکا ہے۔ واثق نے ان کے ساتھ بڑی لطف و مہربانی کا اظہار کیا اور انہیں احمد بن ابی داؤد سے گفتگو کا موقع بھی دیا۔ شیخ نے احمد سے پوچھا کہ تمہاری دعوت کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ خلق قرآن کا اقرار۔ شیخ نے دریافت کیا کہ خلق قرآن کا اقرار کیا کوئی ایسا دینی مسئلہ ہے کہ جس کے بغیر دین کی تکمیل نہیں ہو سکتی؟ قاضی احمد نے اثبات میں جواب دیا۔ شیخ نے پوچھا کیا رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو اس کی دعوت دی تھی؟ انہوں نے جواب دیا نہیں۔ پھر شیخ نے سوال کیا کہ رسول اللہ ﷺ کو اس مسئلہ کا علم تھا یا نہیں؟ قاضی نے اس کا جواب بھی اثبات میں دیا۔ اس پر انہوں نے پوچھا کہ تم ایسی چیز کی طرف لوگوں کو دعوت کیوں دیتے ہو جس

کی رسول اللہ ﷺ نے دعوت نہیں دی؟ اور جس کے بارے میں ہمیں آزاد چھوڑ دیا گیا ہے؟ قاضی لاجواب ہو گئے لیکن اس کے بعد بھی گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔

شیخ کی مندرجہ بالا گفتگو سے واثق باللہ پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے اسی وقت ان کی بیڑیاں کٹوا دیں اور انعام و اکرام سے نوازنا چاہا۔ لیکن انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ مہدی کا بیان کہ شیخ کی گفتگو پر واثق باللہ رونے لگا اور حاضرین بھی آبدیدہ ہو گئے۔ مہدی خود اپنے بارے میں یہ کہتا ہے کہ اسی واقعہ کے بعد میری طبیعت خلق قرآن کے عقیدے سے پھر گئی۔ اور مہدی کا یہ بھی خیال ہے کہ واثق کے عقیدے میں بھی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ آثار یہ بتاتے ہیں کہ اس کا خیال بڑی حد تک درست تھا۔ واثق کے خیالات میں تبدیلیاں ہوئیں اس لئے کہ سیوطی کے قول کے مطابق اس نے پھر اس واقعہ کے بعد کسی عالم کا مسئلہ خلق قرآن کے سلسلہ میں امتحان نہیں لیا۔ مگر اس کے عہد میں علم کلام کو فروغ ضرور حاصل ہوا۔ اور علم کلام کے مخالفین یہ محدثین اور فقہاء کے عقائد و خیالات کی توسیع و اشاعت پوری طرح زور نہ پکڑ سکی۔

متوکل علی اللہ

واثق کے بعد جب اس کا بھائی متوکل تخت نشین ہوا تو اس نے مناظرہ اور مباحثہ کی سختی سے ممانعت کر دی۔ اور علماء و مجتہدین کی تقلید کا حکم عام جاری کیا۔ علماء اہل سنت اور محدثین کو اپنے خیالات کے اظہار پر مامور کیا۔ احمد بن ابی داؤد جو مامون کے وقت سے قضاء کے عہدے پر مامور تھے انہیں معزول کر کے ان کی جگہ پر ۲۴۰ھ میں یحییٰ بن اکثم کو قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ اسی وقت سے احمد بن ابوداؤد کے برے دن شروع ہو گئے۔ اور اس کے بیٹے ابوالولید پر خلیفہ کی ناراضی اتنی بڑھی کہ ان کے سارے مال و اسباب بحق سلطنت ضبط کرا لئے۔

علم کلام کی سرپرستی متوکل سے قبل دربار خلافت سے ہوتی رہی لیکن خود متوکل نے اس سے ہاتھ کھینچ لیا جس کے نتیجے میں علم کلام کی مخالفت شروع ہوئی اور متکلمین کی مخالف جماعتوں کا اثر ورسوخ بڑھا۔ علماء حق اور فقہاء ملت کی طاقت وقوت میں اضافہ ہوا۔ لیکن یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ علم کلام پر اتنے دنوں کی محنت اور اس کی توسیع واشاعت اچانک ہی ختم نہیں ہوئی۔ علماء متکلمین اپنے طور پر اس علم کو آگے بڑھانے کی خدمت میں مشغول رہے اور اسلام یا مذہب پر غیر مسلموں یا مشرکین کے جو اعتراضات تھے یا پیدا ہو گئے تھے ان کے فلسفیانہ جوابات میں مشغول رہے۔ اس طرح علم کلام کا وجود تو باقی رہا لیکن اس کو صحیح سمت مل گئی۔

تیسری صدی جو علم کلام کی تاسیس اور کمال کا عہد ہے اس میں جو علماء کلام پیدا ہوئے ان میں جاحظ، نظام، ابوالہذیل علاف، احمد بن ابی داؤد، جعفر بن حرب، ابو موسیٰ الفراء، عبدالرحیم بن محمد بن عثمان اور خیاط بہت زیادہ مشہور ہیں۔

ماخذ

(تاریخ الخلفاء، مروج الذہب، تاریخ الکامل، تاریخ بغداد،
الملل و النحل، علم الکلام، فہرست ابن ندیم البرامکہ،
المنیة الامل، ضحیٰ الاسلام، وفیات الاعیان، جامع ترمذی،
الفرق بین الفرق، کتاب الانساب، فجر الاسلام، شرح عقائد نسفی،
ادبیات ایران، مقدمہ ابن خلدون، انسائکلو پیڈیا آف اسلام)

چوتھی صدی میں علم کلام

چوتھی صدی ہجری میں علم کلام کے ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔اس سے قبل قرآن شریف کی تفسیر روایات کی بنیاد پر ہوا کرتی تھی لیکن جب قرآنی موضوعات پر عقل کی روشنی میں گفتگو ہونے لگی تو اس کی ضرورت محسوس کی گئی کہ قرآنی آیات کا اثبات بھی دلائل عقلیہ سے کیا جائے۔اس صدی کے چند مشہور علماء ابو مسلم اصفہانی، ابوبکر اصم، ابو قاسم بلخی اور قفال کبیر نے اس خدمت کو بخوبی انجام دیا۔

ابو مسلم محمد بن بحر اصفہانی ایک بہترین متکلم اور ادیب تھے۔ صاحب کشف الظنون کے قول کے مطابق ان کی تفسیر **جامع التاویل لمحکم التنزیل** تیرہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ امام رازی اس تفسیر کے سلسلہ میں ان کی دقت نظری کے قائل ہیں۔ اصفہانی آیات قرآنیہ کے ناسخ ومنسوخ ہونے کے قائل نہ تھے۔ ان کا انتقال ۳۲۲ھ میں ہوا۔

قفال کا نام محمد بن علیل اسماعیل تھا۔ وہ تفسیر ، حدیث ، کلام، ادب اور اصول دین کے امام تصور کیے جاتے ہیں۔امام اشعری ان کے شاگردوں میں تھے۔ ۳۶۵ھ میں انہوں نے وفات پائی۔

ان لوگوں کے علاوہ اس صدی کے مشاہیر علمائے کلام میں جن حضرات کا نام سرفہرست ہے وہ یہ ہیں:

محمد عبد الوہاب جبائی، کعبی ، امام اشعری، امام ابو منصور ماتریدی، سیرانی اور علی بن عیسیٰ رمانی۔

پانچویں صدی

چوتھی صدی کے اواخر میں علم کلام مائل بہ انحطاط ہونے لگا تھا۔ اس کے باوجود چند بلند پایہ متکلمین اس عہد میں بھی موجود تھے جن میں سے ابواسحاق اسفرائینی قاضی عبدالجبار معتزلی، باقلانی، محمد علی البصری اور علامہ ابن حزم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سال وفات کے اعتبار سے امام غزالی کا تعلق چھٹی صدی ہجری سے ہے۔ لیکن پانچویں صدی کے آخری دور سے ہی ان کی متکلمانہ تصنیفات کی گرم بازاری رہی اس لئے میں نے انہیں بھی پانچویں صدی کے علماء متکلمین کی فہرست میں شامل کرلیا ہے۔

علم کلام کا زوال

علوم وفنون کی اشاعت وترقی بڑی حد تک حکومت کے استحکام اور استقلال سے سروکار رکھتی ہے۔ چوتھی صدی ہی سے دولت عباسیہ کی بنیادیں کمزور ہو چلی تھیں۔ خلفاء اپنی مستقل حیثیت اور سلطنت پر اپنی گرفت کھوتے جارہے تھے۔ اس کے علاوہ اقتدار کی باگ ڈور ایسے ہاتھوں میں آگئی تھی جنہیں علم وفن سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ انہیں صرف اور صرف اپنے اقتدار سے تعلق تھا۔ خلافت عباسیہ پر ترک دیلم کے تسلط کی وجہ سے علم کی جو گرم بازاری تھی وہ پوری طرح ماند پڑ چکی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء کی تخلیقی اور اجتہادی قوتیں مفلوج ہوکر رہ گئیں۔ اس لئے جس طرح دیگر علوم کے ماہرین اور علمائے دین اپنی اجتہادی حیثیت کھوکر تقلید اور تائید کرنے والوں میں شامل ہوگئے۔ اسی طرح علم کلام کا بھی تخلیقی اور اجتہادی سرچشمہ خشک ہوگیا۔ دیکھا

جائے تو تصانیف کا سلسلہ اس دور میں بھی قائم رہا لیکن وہ صرف تفسیر و تشریح تک ہی محدود رہا۔ پانچویں صدی ہجری کے بعد چند افراد کو چھوڑ کر کوئی ایسی اہم ہستی نظر نہیں آتی جس نے علم کلام کو نئی زندگی بخشی ہو۔

علم کلام کے فوائد اور نقصانات

عالم اسلام پر سب سے برا وقت وہ آیا جب فلاسفہ یونان کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہونے لگیں اور ان کے خیالات سے مسلمانوں کو واقفیت حاصل ہوئی۔ علماء کی ایک جماعت نے تو اس پر اعتماد بھی نہیں کیا اور نہ قابل توجہ سمجھا، لیکن انہیں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ان فلسفیانہ موشگافیوں سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور ارسطو اور افلاطون کے اقوال کو وحی الٰہی کی طرح تسلیم کرنے لگے۔

علم کلام کا ایک بڑا احسان تو یہ ہے کہ اس نے مرعوبیت اور تقلید محض کو ختم کر دیا اور فلاسفہ یونان کے جواب میں تنقید و نکتہ چینی کی جرأت پیدا کی۔ اس طرح معقولات کے میدان میں بھی علماء اسلام کو اپنے دینی افکار اور ان کی خوبیوں کو اجاگر کرنے کا پورا پورا موقع ملا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ تقلید محض میں جو خشونت اور تنگ نظری پیدا ہوگئی تھی وہ علم کلام کی روشنی میں وسیع النظری میں بدل گئی۔ اور علماء و مجتہدین کو اپنے خیالات کے اظہار کی پوری آزادی نصیب ہوئی۔ اسلامی فرقوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے ماننے والے بھی اپنے خیالات کا آزادی کے ساتھ اظہار کرنے لگے۔

تیسرا فائدہ یہ ہوا کہ علماء اسلام کے پاس آیات قرآنی اور احادیث نبویہ کا بیش بہا اور قیمتی ذخیرہ تو ضرور موجود تھا لیکن دوسرے مذاہب والوں کے اعتراضات کا رد یا ان کے ذریعہ مدافعت کرنا ممکن نہ تھا۔ ایسی حالت میں علم کلام نے اسلام کو وہ اسلحہ فراہم کر دیا جس سے علمی محاذ پر اس کی مدافعت جم کر کی جا سکے۔

چوتھا فائدہ یہ ہوا کہ عملی اعتبار سے تقلید وانقیاد کا جذبہ مفید تو ضرور ہے لیکن علمی حیثیت سے یہ ذہنی قوتوں کو معطل کر دیتا ہے۔ اسی لئے جب تک علم کلام کا زور رہا علماء اسلام کا ذہن اجتہاد واختراع کی طرف مکمل طور سے مائل رہا لیکن جیسے جیسے علم کلام روبہ انحطاط ہوا تمام علوم وفنون کا اجتہادی اور تخلیقی سرچشمہ خشک ہو گیا اور خود علم کلام بھی تقلید محض بن کر رہ گیا۔

مختلف اعتبار سے علم کلام نے اسلام کو فائدہ بھی پہنچایا، لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مذہب کا اصلی مقصد یعنی احیاء قلب اور روحانی سکون علم کلام نے ختم کر دیا کیونکہ قرآن وحدیث کو بھی فلسفہ کی عینک لگا کر دیکھا جانے لگا، جو ذہنی نشو ونما کے لئے مفید تو تھا لیکن روحانی بالیدگی اور قلبی سکون کے لئے انتہائی مضر تھا۔ اس معاملہ میں معتزلہ ہوں یا اشاعرہ یا ماترید یہ سب کا ایک ہی حال ہے۔ علم کلام غیر مسلموں کے اعتراضات اور مباحث کے جواب کے لئے ایک مضبوط ہتھیار کا کام کرتا تھا اور اپنے اوپر ہر طرح کے حملہ کی مدافعت کرتا تھا۔ لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ مسلمانوں نے اس سے دشمنوں کے مقابلہ کا جتنا کام لیا اس سے زیادہ دوستوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنانے کے لئے استعمال کیا۔ خلیفہ مامون سے لے کر متوکل سے قبل تک یہ سلسلہ جاری رہا اور ائمہ دین وعلماء مجتہدین اس کے ذریعہ طرح طرح کی آزمائشوں میں ڈالے جاتے رہے۔ سیاسی جنگ کا جواب ہتھیار کے ذریعہ دیا جا سکتا ہے لیکن عقائد کے اختلافات تو فلسفہ کی گتھیوں میں ہی الجھ کر رہ گئے۔ اور اس کے نتیجہ میں اسلام میں بے شمار فرقے پیدا ہوتے گئے جو ایک دوسرے کی تکفیر وتذلیل کرتے رہے اور ان لوگوں کا ہتھیار یہی علم کلام تھا۔ اس لئے اسلام میں سارے اختلافات کی جڑ اگر اسے کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

(ماخذ: ضحیٰ ءاسلام۔ علم کلام)

علم کلام کے مباحث

مباحث کے اعتبار سے علم کلام کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے۔ایک علم کلام وہ ہے جو اسلامی فرقوں کے باہمی ختلافات سے پیدا ہوا اور ایک دوسرے کے اصولوں کے رد میں دلائل پیش کیے گئے۔دوسرا علم کلام وہ ہے جو فلسفہ کے مقابلہ کے لئے ایجاد ہوا۔اس طرح علم کلام کے ذمہ دو اہم خدمتیں سپرد ہوئیں۔

(۱) فلاسفہ ملاحدہ اور دیگر مذاہب کا رد اور مدافعت۔

(۲) اسلامی عقائد کا اثبات۔

دوسرے مذاہب کا رد

دوسرے مذاہب کے رد کے سلسلہ میں ابن ندیم نے یعقوب کندی کے تین رسائل کا تذکرہ کیا ہے۔ایک رسالہ پارسیوں کے ایک فرقہ منانیہ کے اصول کے رد میں تھا۔دوسرا پارسیوں کے مشرکانہ عقیدہ اور دو خدا (اہرمن و یزداں) کے رد میں لکھا گیا تھا اور تیسرا رسالہ فلاسفہ کے فرقہ سوفسطائی کے اصول پر اعتراض کی شکل میں تھا۔

کندی کے بعد جاحظ نے یہود و نصاریٰ کے رد میں کتابیں لکھیں۔دیگر علماء نے بھی اس موضوع پر بے شمار کتابیں تصنیف کیں جن میں علامہ ابن حزم کا نام سر فہرست ہے، جنہوں نے یہود و نصاریٰ، صائبین اور مجوسیوں کے رد میں اپنی کتابوں میں تفصیلی بحث کی۔

یحیٰ بن جذلتہ جو ایک عیسائی تھا اور ولید معتزلی سے متاثر ہو کر ۴۶۶ھ میں مشرف بہ اسلام ہوا تھا اس نے توریت وانجیل میں رسول اکرم ﷺ کے متعلق جو پیشین گوئیاں تھیں ان پر مشتمل ایک کتاب لکھی۔

فلسفہ کے جو مسائل اسلامی اصول کے خلاف پڑتے تھے متکلمین نے ان

کے رد کے ساتھ ساتھ علم فلسفہ پر عمومی تنقید بھی کی ہے۔اور بہت سے ایسے مسائل کو جنہیں فلسفہ سے متاثر ہو کر صحیح سمجھا جا رہا تھا ان کے غلط ہونے کا ثبوت بھی پیش کیا۔ اس سلسلہ میں حضرت امام غزالی نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔

اسلامی عقائد کا اثبات

جیسا کہ میں نے گزشتہ اوراق میں ذکر کیا اور تفصیلی روشنی بھی ڈالی ہے کہ اسلامی عقائد کی بنیاد تین عناصر پر ہیں۔توحید۔رسالت۔ایمان بالغیب۔

انہیں تین بنیادی مسائل کے اثبات و انکار کے سلسلہ میں بے شمار نئے نئے مباحث سامنے آئے اور موافقت و مخالفت میں تقریر و تحریر دونوں ہی کا سہارا لیا گیا۔اور سارا زور اسے ثابت کرنے یا اس کے رد کرنے پر لگایا گیا۔ جو مسائل توحید پر بحث کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئے ان کی تفصیل اس طرح بیان کی جاسکتی ہے۔

عالم کی علت العلل محض ایک ہے۔

خدا خالق خیر و شر دونوں ہے۔

عالم حادث ہے اور اس کے لئے کسی مدبر کا ہونا لازمی ہے۔

صرف باری تعالیٰ قدیم ہے، اس کے علاوہ اور کوئی چیز قدیم نہیں۔

تمام اشیاء حادث ہیں۔

توحید فی الصفات اور توحید فی العبادات۔

خدا تمام اشیاء کا بالذات خالق ہے یا بالواسطہ۔

نبوت سے متعلق جو مسائل پیدا ہوئے وہ اس طرح ہیں:

نبوت و وحی کا اثبات

معجزات و خوارق عادات

نبوت و وحی کی حقیقت

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوت کا اثبات اور

اس سلسلہ میں دیگر مصاحف کی پیشین گوئیاں

ایمان بالغیب یا معاد و آخرت کے سلسلہ میں جو مسائل پیش آئے ان میں

چند اس طرح ہیں:

روح کی حقیقت

روح اور جسم کے تعلق کی نوعیت

تناسخ ارواح

حشر و نشر کا اثبات

جنت و دوزخ کا وجود۔ اثبات اور اس کی حقیقت

قضاء و قدر

قیام قیامت

ملائکہ کا وجود وغیرہ۔

یہاں کلامی مباحث کی تفصیل میں نہ جا کر علم کلام کے خصوصی اور اہم مسائل کو سامنے رکھا گیا ہے۔ اس لئے کہ اس سے زیادہ تفصیل کی گنجائش نہ تھی۔ اسلامی فرقوں کے باہمی اختلافات اور ان سے پیدا شدہ مسائل کی کچھ وضاحت آئندہ ابواب میں لی گئی ہے۔

(ماخذ: علم الکلام. الکلام. الملل و النحل. الفصل فی اھواء الملل و النحل، ابن حزم. نگار – علوم اسلامی نمبر. ضحی الاسلام)

علم کلام اور اسلامی فرقے

ابتدائی دور میں اسلام میں جو فرقے پیدا ہوئے ان میں اکثر سیاسی اسباب کی بنا پر تھے۔ بعد میں عقائد، اصول اور کلامی مسائل کی وجہ سے بے شمار فرقے پیدا ہوتے چلے گئے۔ لیکن جو فرقے سیاسی حالات کی وجہ سے عالم وجود میں آئے تھے وہ بھی کسی نہ کسی طرح کلامی مسائل میں الجھ کر رہ گئے۔ اس لئے کہ ان تمام فرقوں کی بنیاد ایک طرح سے کلامی مسائل ہی سے متعلق ہو جاتی ہے۔ مثلاً خلافت و امامت کا مسئلہ۔ وراثت نبوی کا جھگڑا۔ یہ سب وقتی مسائل تھے لیکن عقائد و کلام کی کتابوں میں انہیں ایک مستقل حیثیت دے دی گئی اور ان کی بنیاد پر جو فرقے پیدا ہوئے انہوں نے بھی مسائل کلامیہ کا سہارا لے کر اس قدر موشگافیاں کیں اور اتنی بحثیں ہوئیں کہ ایک فرقے سے ان گنت اور بے شمار فرقے پیدا ہوتے چلے گئے۔

علامہ شبلی نے شرح مواقف کے حوالہ سے بنیادی طور پر آٹھ فرقوں کا ذکر کیا ہے جو یہ ہیں۔ شیعہ۔ سنی۔ خوارجی۔ مرجئیہ۔ نجاریہ۔ معتزلہ۔ جبریہ۔ مشبہہ۔

عبدالقادر بغدادی نے اپنی کتاب الفرق بین الفرق میں ان تمام فرقوں پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔ شہرستانی نے بھی تقریباً ان تمام ہی فرقوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ میں انہیں کتابوں کی بنیاد پر ان تمام فرقوں کی ایک اجمالی فہرست پیش کرتا ہوں جو پانچویں صدی ہجری تک ظہور میں آ چکے تھے۔ گرچہ تاریخ الجہمیہ و المعتزلہ، المنیۃ الامل اور علم الکلام میں بھی ان مختلف فرقوں پر بحث ملتی ہے لیکن اسے سیر حاصل نہیں کہا جا سکتا ہے اور نہ انہیں بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔

خوارج ان کے عقائد اور مختلف فرقے

جنگ صفین کے موقع پر حضرت علیؓ نے اپنی طرف سے ابو موسیٰ اشعریؓ کو اور حضرت امیر معاویہؓ نے اپنی جانب سے عمرو بن العاص کو حَکَم مقرر کیا تو حضرت علیؓ

کی جماعت میں سے ایک گروہ نے اس پر اپنی ناراضی ظاہر کی کہ ان میں سے اکثر افراد بنوتمیم سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی دلیل یہ تھی کہ کسی کو حکم مقرر کرنا قرآن کی مخالفت کرنا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان الحکم الا للہ اور مخالفت قرآن کفر ہے اس لئے (نعوذ باللہ) حضرت علیؓ نے تحکیم کو قبول کر کے کفر کا ارتکاب کیا ہے۔ وہ اس شرط پر حضرت علیؓ کا ساتھ دینے کو تیار تھے کہ اپنی غلطیاں تسلیم کر لیں اور اپنے کفر کا اقرار کریں اور اس سے توبہ کریں۔ حضرت علیؓ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ لوگ اپنے خیال سے باز نہ آئے اور حضرت علیؓ بھی ان کے خیال سے متفق نہیں ہوئے، جس کے نتیجے میں انہوں نے حضرت علیؓ کی فوج سے علیحدگی اختیار کر لی اور کوفہ کے قریب ایک گاؤں میں چلے گئے جس کا نام ''حرورا'' تھا۔ اسی بناء پر اس گروہ کو حروریہ کہنے لگے۔ اس کے علاوہ چونکہ ان لوگوں نے اپنا نعرہ ان الحکم الا للہ مقرر کیا تھا اس لئے ان کا نام محکمہ بھی پڑ گیا۔ حضرت علیؓ کی فوج سے نکل جانے کی وجہ سے انہیں خوارج یا خارجی کہا جانے لگا۔ یہ لوگ خود اپنے اس نام خارجی کو خروج فی سبیل اللہ سے مشتق بتاتے ہیں اور اپنی جماعت کو شراۃ کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ اس طرح وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ہمارا گروہ وہ ہے جس نے ومن الناس من یشری نفسہ ابتغآء مرضات اللہ (اور بعض آدمی وہ ہیں جو اللہ کی رضا جوئی میں اپنی جان تک کو قربان کر دیتے ہیں) کے مطابق اپنے آپ کو اللہ کی مرضی پر قربان کر دیا تھا۔ اس جماعت کا مقابلہ نہروان میں حضرت علیؓ سے ہوا۔ بے شمار لوگ مارے گئے لیکن اس کا زور کم نہ ہوا بلکہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ دولت امویہ میں اس گروہ نے بعض علاقوں پر قبضہ کر لیا اور اس کی حکومت میں استحکام اور مضبوطی بھی پیدا ہوئی۔ اس کی وسعت کرمان و فارس کے علاقوں تک ہوگئی۔ مہلب بن ابی صفراء نے ایک بڑی فوج لے کر ان لوگوں کا شدت کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن اس کی طاقت میں اور غلبہ میں کوئی کمی نہ آئی اور امویوں کے لئے یہ جماعت آخر عہد تک سر درد بنی رہی۔ عہد عباسیہ میں

اس کا زور آہستہ آہستہ کم ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ اس کا وجود ہی ختم ہو گیا۔

عقائد

حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کی تکفیر۔ اصحاب جنگ جمل، حکمین اور ہر اس شخص کو کافر سمجھنا جس نے تحکیم یا حکمین میں سے کسی ایک کو برحق سمجھا ان کا خاص عقیدہ تھا اور اسی کو لے کر یہ آگے بڑھے۔ اور حضرت امام جابر کے مقابلے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ صاحب الفرق بین الفرق کعبی کا یہ قول لکھتے ہیں:

مرتکب کبائر کی تکفیر میں بھی خوارج کے تمام فرقے متفق ہیں۔ پھر امام ابو الحسن اشعری کے حوالہ سے اس قول کی نفی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ خوارج کے بعض فرقے مثلاً النجدات تکفیر مرتکب کبیرہ کے قائل نہیں ہیں۔ عبد القاہر بغدادی نے خوارج کے بیس فرقوں کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے اور ان کے جزوی عقائد کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جن میں سے چار فرقے زیادہ اہمیت اور شہرت کے حامل ہیں جو درج ذیل ہیں:

ازارقہ نافع ابن الازرق کے متبعین کو کہتے ہیں۔

النجدات نجدہ بن عامر کی جانب منسوب ہے۔

الاباضیہ عبداللہ بن اباض التمیمی کی طرف منسوب ہے۔

الصفریہ زیاد بن الاصفر کی طرف منسوب ہے۔

(ماخذ: علم الکلام، فجر الاسلام، الفرق بین الفرق، الملل و النحل)

شیعہ: ان کے عقائد اور مختلف فرقے

حضرت علیؓ کا ساتھ دینے کی وجہ سے ایک جماعت شیعان علی کے نام سے وجود میں آئی جسے عرف عام میں شیعہ کہا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ امامت وخلافت ایسا مسئلہ نہیں جس کا اختیار امت کے ہاتھوں میں ہو بلکہ اس کا فیصلہ نص قرآن یا وصیت سے ہونا چاہئے۔ اس مسئلہ میں اس جماعت کے سارے فرقے متفق ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے بعد حق خلافت نصاً اور وصایۃً حضرت علیؓ کو پہنچتا ہے اور ان کے بعد یہ حق ان کی اولاد کو حاصل ہوا۔ لیکن ان کی اولاد کی امامت کے سلسلہ میں اس جماعت میں بھی بے شمار فرقے پیدا ہوئے اور مختلف خیالات ظاہر کیے گئے۔ درحقیقت یہ فرقہ بھی خوارج کی طرح سیاسی نوعیت کا تھا، لیکن بعض سیاسی مسائل ایسے بھی تھے جن کی بنیاد عقائد پر تھی اس لئے ان فرقوں نے بھی علم کلام کو نئے نئے موضوعات سے روشناس کرایا۔

عقائد

شیعوں کے بنیادی عقائد میں امامت وخلافت کے متعلق یہ خیال پایا جاتا ہے کہ اس کا تعلق عوام یا شوریٰ سے نہیں ہے بلکہ امر الٰہی اور رکن دین سے ہے۔ یہ عصمت ائمہ، تقیہ اور تبراء پر اعتقاد رکھتے ہیں اور جو شخص امامت اور امام کی مخالفت کرے اسے کافر گردانتے ہیں۔ ان کے بعض فرقے بہت ہی مبالغہ اور غلو سے کام لیتے ہیں۔ بعض اعتدال پسند ہیں۔ جو غالی فرقے ہیں انہوں نے الوہیت ائمہ اور

حلول باری تعالیٰ جیسے عقیدے کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے محرمات شرعیہ کو جائز قرار دے دیا ہے اور فرائض دینیہ کو بھی ساقط کر دینے کے قائل ہیں۔ ان فرقوں کے نام اس طرح ہیں۔ نبانیہ۔ مغیریہ۔ جناحیہ۔ منصوریہ۔ خطابیہ اور حلولیہ۔

اعتدال پسند فرقوں میں بعض فرقے اپنے عقائد میں اس حد تک تبدیلی لے آئے ہیں کہ انہوں نے امامت کو شوریٰ کے حوالہ کرنا قرار دے دیا ہے۔ اور وہ اس کے بھی قائل ہیں کہ مفضول کی امامت جائز ہے اس لئے وہ شیخین کی امامت کے منکر نہیں۔ ان کا قول ہے کہ حضرت علیؓ کی موجودگی میں جو اولیٰ بالامت تھے شیخین (ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ) کی بیعت کر لینی خطا تو ضرور ہے لیکن اس سے کفر و فسق لازم نہیں آتا۔ اس خیال کے جو گروہ قائل ہیں ان میں سلیمانیہ اور تبریہ بہت اہم ہیں۔

شہرستانی نے شیعوں کو پانچ بنیادی فرقوں میں تقسیم کیا ہے جو اس طرح ہیں: کیسانیہ۔ زیدیہ۔ امامیہ۔ غلاۃ۔ اور اسماعیلیہ۔ لیکن عبد القاہر بغدادی نے اسماعیلیہ کو امامیہ ہی کی ایک شاخ قرار دیا ہے۔

(ماخذ: الملل و النحل ، الفرق بین الفرق ، فجر الاسلام)

قدریہ یا معتزلہ

سب سے پہلے علم کلام کا جو مسئلہ معرض بحث میں آیا وہ جبر و اختیار کا تھا۔ قرآن کریم کی بعض آیتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان مجبور محض ہے۔ آیات کریمہ:

(۱) **ختم الله علی قلوبهم وعلی سمعهم وعلی ابصارهم غشاوه** (اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے)

(۲) وان تصبهم حسنة يقولوا هذه من الله و انتصبهم سيئة يقولوا هذه من عندک. قل کل من عند الله- (اور اگر انہیں فائدہ پہنچتا ہے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تمہاری وجہ سے ہے۔آپ کہہ دیجئے کہ تمام چیزیں اللہ کی طرف سے ہیں)

(۳) ولله ملک السموٰت و الارض و ما بينهما يخلق ما يشاء و الله علی کل شیء قدير- (آسمان وزمین اور اس کے درمیان جتنی چیزیں ہیں سب اللہ کے لئے ہیں جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے)

آیات مذکورہ بالا کے مفاہیم واضح طور پر انسان کے مجبور محض ہونے پر دلالت کرتے ہیں لیکن اس کے برخلاف کلام پاک میں ایسی آیتیں بھی بکثرت موجود ہیں جو انسان کی قدرت اور اختیار پر دلالت کرتی ہیں۔ جیسے آیات کریمہ:

(۱) انا هديناه السبيل اما شاکرا و اما کفورا (میں نے انہیں راستہ دکھا دیا ہے اب چاہے وہ شکر ادا کریں یا اس سے انکار کریں)

(۲) فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليکفر (پس جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کی مرضی ہو وہ انکار کرے)

(۳) ومن يکسب اثما فانما يکسبه علی نفسه
(اور جو شخص گناہ کرتا ہے تو وہ اپنی ذات پر اس کا اثر پہنچاتا ہے)

اسلام سے قبل فلاسفہ یونان اور زردشتیوں میں مسئلہ جبر وقدر کی بنیاد پر کافی اختلافات رہے ہیں۔ جب اسلام سے ان کا واسطہ پڑا تو چونکہ ان کا تعلق مجوسیت یا عیسائیت کے واسطہ سے فلسفہ یونان سے تھا اس لئے یہ آیتیں زیر بحث آنے لگیں۔ اور ایک گروہ ایسا پیدا ہوا جس نے جبر محض کو ہی درست اور صحیح سمجھا۔ دوسری جماعت انسان کو مختار مطلق سمجھنے لگی۔

مسئلہ قدر پر گفتگو کرنے والوں میں سب سے پہلے معبد جہنی اور غیلان دمشقی کا نام لیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال بھی ہے کہ اس عقیدے کا تعلق ایک نصرانی سے ہے جو عراق کا باشندہ تھا اور اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہو کر پھر سے عیسائی ہو گیا تھا۔ سب سے پہلے اسی نے اس خیال کو پیش کیا اور چونکہ معبد جہنی اور غیلان دمشقی ان کے حمایتیوں میں تھے اس لئے وہ بھی اس مسئلہ میں اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔

واصل بن عطا اور عمرو بن عبید نے اس مسئلہ میں قدریہ کی حمایت کی اور کہا کہ انسان اپنے فعل میں مختار مطلق ہے اور اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ مومن رہتا ہے اور نہ کافر۔ اس طرح جمہور امت کے مسلمہ عقیدہ کو تسلیم کرنے سے ان لوگوں نے اعراض کیا اور فرقہ قدریہ ہی میں اور ایک فرقہ پیدا ہو گیا جو معتزلہ کے نام سے مشہور ہوا۔

معتزلہ کی وجہ تسمیہ

عام طور پر معتزلہ کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب واصل بن عطا اور عمرو بن عبید نے اپنے عقائد و خیالات کا برسرعام اظہار کیا تو حسن بصریؒ نے اپنی مجلسوں سے انہیں نکال باہر کر دیا اور فرمایا **اعتزل واصل** (ہم سے واصل علیحدہ ہو گیا) اسی وجہ سے واصل اور ان کے متبعین کو معتزلہ کے نام سے پکارا جانے لگا۔ لیکن احمد امین نے اپنی کتاب فجر الاسلام میں اس خیال کو درست قرار نہیں دیا ہے اور اپنے دعویٰ کے ثبوت میں انہوں نے حسب ذیل تین دلائل پیش کیے ہیں۔

(۱) واصل اور عمرو بن عبید کا مسجد میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جانا کوئی

ایسا اہم واقعہ نہیں جس سے کسی فرقہ کو موسوم کیا جائے اس لئے کہ فرقوں کا نام عقائد و خیالات کی بنیاد پر رکھا جاتا ہے نہ کہ کسی سطحی واقعہ کی بنا پر۔

(۲) اس سلسلہ میں جو روایتیں ہیں ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اس واقعہ کو عمرو بن عبید کی طرف منسوب کرتے ہیں اور بعض کے نزدیک یہ واقعہ واصل بن عطا کے ساتھ پیش آیا۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ نام حسن بصریؒ نے ہی رکھا اور کچھ اسے قتادہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس طرح روایت میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے اور اسے حتمی نہیں کہا جا سکتا ہے۔

(۳) اکثر کتابوں میں کسی شخص کا ذکر آتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ ''کان یقول بالاعتزال او ھو من اھل الاعتزال '' تو اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اعتزال ایک مذہب کا نام ہے جس کے تعلق عقائد سے ہے، نہ کہ محض ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جانے کو اعتزال کا نام دیا جائے گا۔

اور ایک خیال معتزلہ کی وجہ تسمیہ سے تعلق کا یہ ہے کہ انہوں نے اگلے فرقے کے عقائد و خیالات سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ''مرجئیہ'' مرتکب کبیرہ کو مومن کہتے تھے اور ''ازارقہ'' کافر کہتے تھے۔ اس طرح ان کا قول ان دونوں سے الگ ہے یعنی نہ مومن اور نہ کافر بلکہ وہ فاسق کے درجہ پر ہوگا۔

ایک اور خیال کے مطابق واصل کا حضرت حسن بصری کی مجلس سے علیحدہ ہونا دراصل جمہور امت کے مسلمہ عقیدہ سے انحراف کرنا تھا۔ اسی لئے انہیں اس نام سے موسوم کیا گیا۔

احمد امین نے مسعودی کے ایک قول سے تیسرا سبب یہ اخذ کیا ہے کہ معتزلہ اس بات کے قائل نہیں کہ مرتکب کبیرہ کافروں اور مومنوں سے علیحدہ ہے گویا یہی لوگ مرتکب کبیرہ کے اعتزال کے قائل ہیں۔ احمد امین نے دوسرے قول کو ترجیح دیا ہے اور اس پر تفصیلی روشنی بھی ڈالی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اعتزال اور معتزلہ کی

اصطلاح واصل اور عمرو کے واقعہ سے پہلے بھی ملتی ہے۔ کتب تاریخ کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دو فریق کسی مسئلہ میں اختلاف کرتے ہیں اور کوئی شخص ان دونوں کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ دونوں ہی حق پر نہیں ہیں یا کسی کا حق پر ہونا واضح نہیں ہوتا ہے تو وہ ان دونوں سے اپنے آپ کو علیحدہ کر لیتا ہے۔ اسی کے متعلق اعتزال کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مثال کے طور پر احمد امین نے ابوالفداء کے حوالہ سے یہ قول نقل کیا ہے:

''**وسموا هؤلاء المعتزله لاعتزالهم ببيعته علی** ''(حضرت علی کی بیعت سے کنارہ کش ہو جانے کے سبب ان کا نام لوگوں نے معتزلہ رکھ دیا)۔

ان اقوال اور بیانات کے علاوہ تاریخ طبری وغیرہ سے انہوں نے دوسری مثالیں بھی پیش کی ہیں، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جمہور اسلام عام طور پر اس اصطلاح کو معتزلہ کی اہانت کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ لیکن مرتضیٰ زیدی، اس نام سے ان لوگوں کو موسوم کئے جانے کا ایک علیحدہ اور لطیف سبب بھی بیان کرتے ہیں، جس سے معتزلہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

انہوں نے اس نام کا رشتہ قرآن کریم سے جوڑتے ہوئے دو آیتوں کے ٹکڑے ثبوت میں پیش کیے ہیں۔ '' **واعتزلکم** '' اور '' **واهجرهم هجرا جميلا** '' اور پھر اس سلسلے میں ایک قول نقل کرتے ہوئے اسے نبی کریم ﷺ کی طرف بھی منسوب کرتے ہیں:

من اعتزل عن الشر سقط فی الخير

(جس نے برائی سے کنارہ کشی کی وہ بھلائی میں پڑا)

یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ عام طور پر معتزلین اپنی جماعت کو اہل العدل والتوحید یا عدلیہ اور موحدہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

بنیادی عقائد

معتزلہ کے ضمنی فرقوں میں بہت زیادہ باہمی اختلافات پائے جاتے ہیں لیکن بنیادی طور پر درج ذیل مسائل میں یہ متفق نظر آتے ہیں۔

(۱) توحید۔

اللہ تعالیٰ کی صفات ازلیہ کا یہ لوگ مطلقاً انکار کرتے ہیں اور یہ کہتے کہ قدرت، سمع، بصر اور حیات وغیرہ اس کی ذات سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔

(۲) قدر۔

اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا خالق نہیں بلکہ اس کا تعلق محض انسان کی اپنی ذات سے ہے۔

(۳) المنزلة بين المنزلتين۔

مرتکب گناہ کبیرہ ایمان وکفر کے درمیان رہتا ہے۔

(۴) حسن وقبح

(۵) عام صحابہ کے ساتھ تولیٰ اور وہ صحابہ جن کا تعلق اختلاف سے رہا ان سے برأت کا اظہار۔

(۶) امر بالمعروف ونھی عن المنکر کا وجوب

(ماخذ: المنية الامل، الفرق بين الفرق، فجر الاسلام، الملل و النحل)

معتزلہ کے مشہور فرقے اور ان کے عقائد

واصلیہ

یہ فرقہ واصل بن عطا کی جانب منسوب ہے، جس کے بنیادی عقائد درج ذیل ہیں:

(۱) المنزلة بين المنزلتين (۲) نفی صفات (۳) قدر
(۴) اصحاب جنگ جمل اور صفین میں سے کسی ایک کو غلطی پر مانتے ہیں لیکن تعین نہیں کرتے ہیں۔ حالت اشتباہ میں دونوں ہی سے برأت کا اظہار کرتے ہیں

عمرویہ

عمرو بن عبید کے مقلدین کو عمرویہ کہتے ہیں۔ ان کے خصوصی عقائد بھی وہی ہیں جو فرقہ واصلیہ کے ہیں۔ صرف اصحاب جنگ جمل و صفین کے متعلق ان کا خیال جداگانہ ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ دونوں ہی گروہ غلطی پر تھے اور انہیں فاسق قرار دیتے ہیں۔ ان دونوں میں سے کسی کی بھی شہادت قبول کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔

ہذیلیہ

محمد بن ہذیل کے متبعین کو کہتے ہیں، جن کے خصوصی عقائد اس طرح ہیں:
(۱) اللہ تعالیٰ کی قدرت فانی ہے۔ جنت و دوزخ کا فنا ہونا لازمی ہے۔
ان کے علاوہ عبد القاہر بغدادی اور شہرستانی نے کچھ اختلافات کے ساتھ ان کے خصوصی عقائد سے متعلق دس شرطوں کا ذکر کیا ہے جن کی تفصیل محمد بن ہذیل کے حالات کے ضمن میں آئے گی۔

نظامیہ

یہ ابراہیم سیار النظام کے متبعین کا لقب ہے، جن کے خصوصی عقائد قاہر بغدادی نے اکیس اور شہرستانی نے تیرہ تک درج کئے ہیں۔ منجملہ ان کے چند یہ ہیں:

(۱) **ابطال جزء لایتجزی** ۔ قرآن صرف اس حیثیت سے اعجاز ہے کہ مخبر عن الغیب ہے ورنہ اس جیسی تالیف پر (نعوذ باللہ) بندے بھی قادر ہیں ایمان محض اجتناب کبیرہ کا نام ہے، طاعات کا اس میں دخل نہیں۔ اجماع کی اتباع ضروری نہیں، اجسام اعراض کے مجموعے کا نام ہے۔ تمام مخلوقات کی تخلیق ایک ہی وقت میں ہوئی ہے اور اس لحاظ سے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی اولاد پر کوئی تقدیم یا فوقیت حاصل نہیں، رفض صحابہ درست ہے۔

اسواریہ

ابوعلی عمرو بن قائد الاسواری کی جانب یہ فرقہ منسوب ہے، جس کے بنیادی عقائد وہی ہیں جو نظامیہ کے ہیں۔ صرف اختلاف یہ ہے کہ اسواریوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ اس کام کو کرنے کی قدرت نہیں رکھتا ہے جس کے متعلق اسے علم ہے کہ نہیں کر سکے گا اور اس کے برخلاف انسان اس پر قدرت رکھتا ہے۔

معمریہ

منسوب بہ معمر بن عباد السلمی۔ اس کے خصوصی عقائد کے سلسلہ میں عبد القاہر بغدادی اور شہرستانی نے چار نکات کا ذکر کیا ہے جو یہ ہیں: اللہ قدیم نہیں۔ انسان اس جسد کے علاوہ ایک شئے بھی ہے۔ اور حیّ (زندہ) عالم، قادر اور مختار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اعراض کو پیدا نہیں کیا ہے بلکہ اعراض اجسام کے اختراعات ہیں۔

اسکافیہ

یہ ابو جعفر محمد بن عبد اللہ الاسکافی (متوفی ۲۴۰ھ) سے منسوب ہے، جو نظام اور جعفر بن حرب کے خیالات وعقائد سے بہت زیادہ متاثر تھے لیکن چند مسائل میں اختلاف بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً نظام کا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ جور وظلم اور کذب و افتراء پر قادر نہیں ہے اوران کے اسلاف اس کے قائل تھے کہ اللہ تعالیٰ جور وظلم پر قادر تو ہے لیکن ان کا ارتکاب نہیں کرتا۔ چونکہ ان دونوں کی برائیاں اس کے علم میں ہیں اس لئے وہ ان دونوں سے بے نیاز ہے۔ اسکافی نے ان دونوں کے درمیان کی راہ یہ نکالی کہ اللہ قادر بھی ہے اور نہیں بھی۔ وہ اس طرح کہ بچوں اور پاگلوں پر ظلم کرنے کی قدرت رکھتا ہے لیکن عاقل انسان پر نہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ پر ان کے اسلاف نے ان کی اور انہوں نے اپنے بزرگوں کی تکفیر کی ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے سے مکلم ہوسکتا ہے متکلم نہیں۔

جعفریہ

یہ فرقہ جعفر بن حرب اور جعفر بن مبشر معتزلی کی جانب منسوب ہے۔ جعفر بن مبشر کا قول یہ ہے کہ اس امت کے فاسق وفاجر اشخاص یہود ونصاریٰ اور زندیقوں سے بدتر ہیں۔ شراب پینے والے کی سزا سے متعلق صحابہ کا اجماع غلط تھا اور صغائر کا مرتکب ہمیشہ دوزخ ہی میں رہے گا۔ جعفر بن حرب یہ کہتے ہیں کہ جملہ کا بعض حصہ جملہ میں شامل نہیں ہوتا۔

بشریہ

یہ فرقہ بشر بن المعتمر سے منسوب ہے۔ شہرستانی نے ان کے خصوصی عقائد چھ بتائے ہیں اور عبد القاہر بغدادی نے پانچ لکھے ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے کہ

انہوں نے صفات کی دو قسمیں کی ہیں۔ صفت ذاتی اور صفت فعلی۔ ارادہ کو صفت فعلی میں شامل کیا ہے۔ قبول توبہ کے لئے شرط یہ ہے کہ دوبارہ وہ گناہ نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے طور پر انہوں نے چند مشورے بھی دے ڈالے ہیں جیسے اگر وہ عقل مندوں کو پہلے ہی جنت میں پیدا کر دیتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔

مزداریہ

ابو موسیٰ عیسیٰ بن صبیح الملقب بہ مزدار کی جانب یہ فرقہ منسوب ہے۔ یہ بشر بن معتمر کے تلامذہ میں تھے اور زہد و ورع کی وجہ سے انہیں راہب المعتمر کہا جاتا تھا۔ ان کے خصوصی عقائد یہ ہیں:

اللہ تعالیٰ ظلم و کذب پر قادر ہے۔ خلق قرآن کا قول درست ہے۔ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے قرآن کا مثل پیش کیا جا سکتا ہے۔ رویت باری تعالیٰ کا انکار اور غلوئے تکفیر۔ مزدار کے تلامذہ میں جعفر بن حرب، جعفر بن مبشر معتزلی، ابو ظفر اور محمد بن سوید خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اسکافی عیسیٰ بن ہشیم اور جعفر ابن الحرب الاشج ان کے ساتھیوں میں تھے۔

ہشامیہ

ہشام بن عمر القوطی کے متبعین کو ہشامیہ کہتے ہیں۔ عبد القاہر بغدادی نے ان کے خصوصی عقائد کی تعداد آٹھ بتائی ہے اور یہ لکھا ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کی بہت سی آیتوں کے خلاف حکم لگایا تھا۔ چنانچہ یہ کہنا کہ ''اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے دلوں میں الفت ڈال دی یا فاسق کو گمراہ کیا'' ان کے نزدیک جائز نہیں۔ اسی طرح حسبنا اللہ ونعم الوکیل کہنا حرام ہے۔ حضرت علیؓ کی خلافت سے انکار کرتے ہیں۔ جو لوگ جنت و دوزخ کے مخلوق ہونے کے قائل ہیں انہیں کافر کہتے ہیں۔ معجزات انبیاء ان کے بعثت کی صداقت کی دلیل نہیں۔

ثمامیہ

ثمامہ بن اشرس نمیری کے متبعین کہ کہتے ہیں۔ قاہر بغدادی کے قول کے مطابق انہوں نے مامون، معتصم اور واثق کا زمانہ پایا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مامون کو اعتزال کی جانب مائل کرنے میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ درج ذیل دو مسائل میں یہ انفرادی عقیدہ کے حامل ہیں جن کی بناء پر ان کی تکفیر اور مخالفت کی گئی۔

(۱) دہریہ، نصاریٰ اور زندیق وغیرہ جانوروں کی طرح قیامت میں مٹی ہو جائیں گے کیونکہ یہ معرفت الٰہی کے لئے پابند نہیں۔

(۲) افعال متولدہ کا کوئی فاعل نہیں۔

انہوں نے ایک بار نمازیوں کو گدھے اور بیل سے تشبیہ دی تھی۔

جاحظیہ

عمر بن یحییٰ المعروف بالجاحظ کی طرف یہ فرقہ منسوب ہے۔ ان کے خصوصی عقاید، ان کے حالات کے ضمن میں تفصیل سے لکھے گئے ہیں جن کا اختصار یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود کسی کو دوزخ میں نہیں ڈالے گا بلکہ دوزخ اسے بالطبع اپنی جانب کھینچ لے گا۔ قرآن جسم رکھتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

حائطیہ

احمد بن حائط کی جانب یہ فرقہ منسوب ہے، جو نظام کے معتقدوں میں سے تھے۔ ان کے اور فضل بن حدثی کے عقائد بہت زیادہ ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ''رب'' اور ''خالق'' دو ہیں یعنی الگ الگ ہیں۔ ایک قدیم یعنی اللہ تعالیٰ اور ایک مخلوق یعنی عیسیٰ بن مریم، جو ابن اللہ اور نبی اللہ تھے۔ قرآن کی آیت **والملک صفاصفا** کا یہ مفہوم ہے کہ قیامت کے روز مخلوق سے حضرت عیسیٰ کے ذریعہ حساب لیا جائے گا۔ تناسخ اربعہ کا قول اور چوپایوں اور پرندوں میں انبیاء کا ظہور ان کے نزدیک جائز ہے۔

خیاطیہ

یہ فرقہ ابوالحسین بن ابی عمروالخیاط کی طرف منسوب ہے جو ابوالقاسم محمد الکعبی کے استاد تھے۔ان کے خصوصی عقائد یہ ہیں۔علم میں جو چیز آسکتی ہے وہ شئے ہے خواہ معدوم ہو یا موجود۔اسی بناء پر اس فرقہ کو معدومیہ بھی کہتے ہیں۔ان کے اس خیال کا ردعلی الجبائی نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔خبراحاد دلیل یا حجت نہیں بن سکتی ہے۔اس خیال کا رد بھی ان کے شاگرد کعبی نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

شحامیہ

ابو یعقوب یوسف بن عبداللہ بن اسحاق الشحام کے متبعین کو کہتے ہیں، جن کے تلامذہ میں سے جبائی خصوصی شہرت کے مالک ہوئے۔ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ایک شئے پر دواشخاص کی قدرت جائز ہے۔

کعبیہ

یہ عبداللہ بن احمد کعبی کے مقلدین کا نام ہے،جن کے عقائد پر مکمل بحث ان کے حالات کے ضمن میں تفصیل سے آئندہ اوراق میں آئے گی۔اجمالی طور پر ان کے خصوصی عقائد اس طرح ہیں۔ارادۂ باری تعالیٰ کوئی قائم بالذات صفت نہیں۔اللہ تعالیٰ کا سمیع وبصیر ہونا اس حیثیت سے ہے کہ وہ مسموعات اور مرئیات کا علم رکھتا ہے۔

جبائیہ

یہ فرقہ ابوعلی محمد بن عبدالوہاب جبائی کی جانب منسوب ہے،جس کے خصوصی عقائد اس طرح ہیں۔طاعات موافقت ارادہ کا نام ہے۔اس لئے جب بندہ کے ارادہ کے مطابق اللہ کا فعل ہو تو وہ بندہ کا مطیع ہوگا۔اللہ تعالیٰ کے اسماء نص قرآنی

سے ثابت ہونے کے باوجود قیاس پر مبنی ہیں۔ اس لئے کہ ہر فعل سے اس کے نام کا اشتقاق ہوسکتا ہے چنانچہ اس کو محبل النساء وغیرہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ عرض واحد کا ممکنات کثیرہ میں ہونا جائز ہے۔

بہشمیہ

یہ فرقہ ابو ہاشم عبدالسلام بن محمد الجبائی کی طرف منسوب ہے۔ یہ عقائد میں زیادہ تر اپنے والد محمد الجبائی سے متفق تھے۔ لیکن بعض مسائل میں انہیں اختلاف بھی تھا جو اس طرح ہے: اللہ تعالیٰ عاصی کو اس کے گناہ کرنے پر عذاب میں مبتلا کرے گا حالانکہ وہ خود عاصی کی تخلیق نہیں ہے۔ زمین و آسمان کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ دنیا کے ایک ذرہ کو بھی فنا کرنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ طہارت واجب نہیں۔

(ماخذ: الفرق بین الفرق - الملل و النحل)

مرجئیہ

وجہ تسمیہ

ارجاء بمعنی تاخیر سے مرجئیہ مشتق ہے۔ ارجاء امید کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ اگر پہلا معنی لیا جائے یعنی تاخیر تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دور صحابہ میں جو خونریزیاں ہوئیں ان کے معاملہ کو قیامت پر اٹھا رکھا جائے اور اس کے متعلق خاموشی اختیار کر لی جائے۔ تاخیر کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ عمل کو ایمان سے موخر الذکر گردانا

جائے۔ دوسرے قول کی بنیاد اس طرح پڑی کہ اس جماعت کے خیال میں ایمان کے ساتھ معصیت کوئی ضرر نہیں پہنچاتی، بلکہ مغفرت کی امید ہر حال میں رہتی ہے۔

مختصر تاریخ مرجئیہ

اختلافات صحابہ کے بعد شیعہ وخوارج کے دو گروہ پیدا ہو گئے جن میں پہلا گروہ حضرت علی کو چھوڑ کر ان سے قبل کے تینوں خلفاء کو حق پر نہیں سمجھتا تھا۔ دوسرا گروہ حضرت علی اور حضرت عثمان اور معاملۂ تحکیم کے ماننے والوں کو سرے سے کافر ہی سمجھتا تھا۔ بنوامیہ کی تکفیر اور لعن طعن پر دونوں ہی متفق ہیں۔ فرقہ مرجئیہ کے ظہور میں آنے کا سبب یہ ہوا کہ اس نے خوارج اور شیعوں کی جنگ سے اپنے آپ کو الگ رکھا۔ اور خوارج، شیعہ اور اموئین جب ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے اور آپس میں لعنت وتکفیر میں مشغول تھے تو ان سبھوں کے ساتھ اس فرقے نے راہ مصالحت اختیار کی اور ان تینوں جماعتوں کو مومنین میں تسلیم کر لیا لیکن یہ بھی کہا کہ بعض ان میں سے برسرِ حق ہیں اور بعض غلطی پر ہیں۔ ہم ان کے تعین سے قاصر ہیں کہ حق پر کون ہے اور کون نہیں اس لئے ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے۔

ابتدا میں اس فرقے کا وجود بھی سیاسی بنیادوں پر عمل میں آیا لیکن بعد میں دوسرے مشہور فرقے شیعہ اور خوارج وغیرہ کی طرح اس کا تعلق بھی عقائد اسلام اور مذہبی اصولوں سے ہو گیا اور اس کا شمار بھی مذہبی فرقوں میں ہونے لگا۔

فروعی اختلافات کی وجہ سے ان کی متعدد شاخیں پیدا ہو گئیں۔ چنانچہ شہرستانی نے اس فرقے کو چار قسموں میں اس طرح بیان کیا ہے۔

(۱) مرجئیہ الخوارج (۲) مرجئیہ القدریہ (۳) مرجئیہ الجبریہ (۴) مرجئیہ الخالصہ۔ پھر مرجئیہ الخالصہ کی بھی پانچ شاخیں درج کی ہیں جو یہ ہیں۔

(۱) یونسیہ-منسوب بہ یونس بن عون سمری

(۲) عبیدیہ-منسوب بہ عبید المکتب

(۳) غسانیہ-منسوب بہ غسان الکوفی

(۴) ثوبانیہ-منسوب بہ ابوثوبان مرجئی

(۵) تومنیہ-منسوب بہ ابومعاذ تومنی

عبدالقاہر بغدادی نے بھی پانچ ہی فرقوں کا ذکر کیا ہے لیکن عبیدیہ کی جگہ ایک دوسرے فرقے مریسیہ منسوب بہ بشر بن غیاث مریسی کا نام لیا ہے۔

بنیادی عقائد

ایمان محض تصدیق بالقلب اور اقرار باللسان کا نام ہے۔ اس لئے عمل کا ایمان میں کوئی دخل نہیں ہے اور گناہ کی وجہ سے اس میں کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ جس طرح کفر کے ساتھ اطاعت سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اس عقیدے کی بناء پر یہ لوگ امویین، خوارج اور شیعہ یہاں تک کہ اخطل وغیرہ جیسے نصرانیوں اور یہودیوں کی بھی تکفیر نہیں کرتے۔

عہد اموی کے بعد اس فرقہ کا کوئی مستقل وجود باقی نہ رہا۔ بلکہ یہ دوسرے فرقوں میں ضم ہو گیا۔ بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ ان کے عقائد کے ذریعہ ایک حد تک امویوں کے عقائد کی تائید ہوتی تھی اس لئے دولت عباسیہ نے اس فرقہ کو پھلنے پھولنے اور آگے بڑھنے نہیں دیا۔

(ماخذ-الفرق بین الفرق-الملل و النحل-فجر الاسلام-تاریخ ادبیات ایران)

اہل حق

اشاعرہ

علمائے سلف کی ایک بڑی جماعت اللہ تعالیٰ کے صفات ازلی کی قائل تھی۔اور صفات ذاتی و صفات فعلی میں کوئی فرق نہیں کرتی تھی۔ جب معتزلہ نے صفات ذاتی کی نفی کی تو انہیں معطلہ کے نام سے یاد کیا جانے لگا اور جو لوگ صفات کے قائل تھے انہیں صفاتیہ کہا جانے لگا۔لیکن اس میں بعض اثبات صفات میں تشبیہ کی حد تک آگے بڑھ گئے۔اس طرح ان میں بھی دو فرقے پیدا ہو گئے ایک نے ان الفاظ کی تاویل کی جن میں باری تعالیٰ کی ایسی صفتیں بیان کی گئی ہیں جو مخلوق سے متشابہ ہیں اور دوسرے نے اس معاملہ میں توقف و تامل سے کام لیا اور کہا کہ ''ہم ان آیتوں کی تفسیر پر مکلف نہیں بلکہ ہمارا عقیدہ لا شریک له و لیس کمثله شیء'' ہونا چاہئے۔ متاخرین کی ایک جماعت نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور ان کی تفسیر کے قائل ہو گئے۔اصحاب سلف میں وہ لوگ جنہوں نے نہ تو تاویل سے تعرض کیا اور نہ تشبیہ کا نشانہ بنے ان میں سے مالک بن انس بھی ہیں جنہوں نے فرمایا الاستوا معلوم و الکیفیة مجھولة والایمان به واجب والسؤال عنه بدعة (استوا علی العرش معلوم ہے لیکن اس کی کیفیت مجہول ہے۔اس پر ایمان لانا واجب ہے لیکن اس کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبل سفیان ثوری اور داؤد اصفہانی بھی اسی عقیدہ کے حامی ہیں۔ پھر ابو العباس قلانسی اور حرث بن اسد المحاسبی کا زمانہ آتا ہے جو سلف صالحین کے ہی طریقے پر تھے۔ان میں اور اصحاب سلف میں کوئی خاص اختلاف نہیں بجز اس کے کہ انہوں نے علم کلام کی طرف توجہ کی اور براہین کلامیہ و دلائل اصولیہ سے ان کے عقائد کی تائید کی۔ان میں سے بعض نے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ فرمائی

اور بعض نے درس و تدریس کے ذریعہ اس خدمت کو انجام دیا۔ یہاں تک کہ حضرت امام ابوالحسن اشعریؒ کا دور آجاتا ہے۔ حضرت اشعری اپنے استاذ سے مناظرے، مباحثے اور اختلافات کے بعد جماعت اہل سنت میں داخل ہو جاتے ہیں اور ایک نئے کلامی فرقہ "اشاعرہ" کا وجود عمل میں آتا ہے، جس کا مسلک اہل سنت والجماعت کا مذہب بن جاتا ہے اور صفاتیہ اشعریہ کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔

حضرت امام ابوالحسن اشعریؒ نے معتزلہ کے اعتراضات کے جواب اور رد میں کثرت سے کتابیں لکھیں۔ شوافع نے ان کے مسلک کو عمومی طور پر قبول کر لیا اور ہزاروں علماء نے ان کی شاگردی کا شرف حاصل کیا جن میں سے ابو سہل صلعوکی، ابو قفال، ابوزید مروزی، ظاہر بن احمد، حافظ ابوبکر جرجانی، شیخ ابومحمد طبری، ابوعبداللہ طائی، ابوالحسن باہلی اور بندار بن حسن صوفی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان کے تلامذہ میں سے ابوبکر باقلانی، ابواسحاق اسفرائینی، ابوبکر ابن فورک اور امام الحرمین جوینی نے اپنے استاذ سے بھی زیادہ شہرت حاصل کی اور ان ہی لوگوں کی کوششوں سے امام اشعری کی تصنیفات دنیائے اسلام میں پھیلیں اور ان کا اصول علم کلام اور عقیدہ ہی ساری دنیا کے مسلمانوں کا عام مذہب بن گیا۔

ابن خلدون لکھتے ہیں کہ امام اشعری تک علم کلام میں فلسفہ کی آمیزش نہ تھی علامہ باقلانی نے چند مسائل جیسے اثبات جوہر فرد، امکان خلاء وغیرہ کا اضافہ کیا۔ پھر امام الحرمین نے علم کلام پر ایک مبسوط کتاب لکھی اور اس کو مختصر کر کے اس کا نام "ارشاد" رکھا، چونکہ امام الحرمین عراق سے لے کر عرب تک مرجع خلائق تھے اس لئے ان کی تصنیفات تمام اسلامی ممالک میں پہنچیں۔ اور اس طرح اشاعرہ کے علم کلام میں فلسفیانہ مباحث کی آمیزش کا دستور عام ہو گیا۔ اس کے بعد منطق و فلسفہ نے کچھ اور زور پکڑا تو ان کلامی مباحث میں دلائل نقلیہ کے علاوہ دلائل منطقیہ سے بھی کام لیا جانے لگا۔

امام غزالیؒ نے اس طرز تحریر کو اپنی تصنیفات کے ذریعہ قبولیت عام اور شہرت دوام کے درجہ تک پہنچایا۔ اشاعرہ کے عقائد کو منطقیانہ دلائل سے بڑی طاقت و قوت ملی جس کے نتیجہ میں اشاعرہ کا کلام ہی عالم اسلام کا عمومی عقیدہ اور مذہب بن گیا

عقائد

اشاعرہ کے مخصوص عقائد کو حضرت امام غزالی نے احیاء العلوم میں اجمالاً نقل کیا ہے اور اس کے چار ارکان مقرر کر کے ان کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے۔

رکن اول - ذات الٰہی جس کے اصول عشرہ یہ ہیں:

- خدا موجود ہے، واحد ہے، قدیم ہے، جوہر نہیں، جسم نہیں، عرض نہیں، کسی جہت کے ساتھ مخصوص نہیں، کسی مکان میں نہیں، وہ نظر آ سکتا ہے اور ہمیشہ رہے گا

رکن دوم - صفات الٰہی جس کے اصول عشرہ یہ ہیں:

خدا زندہ ہے، عالم ہے، قادر ہے، صاحب ارادہ ہے، سنتا ہے، دیکھتا ہے بولتا ہے، حوادث سے بری ہے، اس کا کلام قدیم ہے، اس کا ارادہ وعلم بھی قدیم ہے۔

رکن سوم - افعال الٰہی جس کے اصول عشرہ اس طرح درج کرتے ہیں

افعال عباد کا خالق خدا ہے۔ افعال عباد الٰہی مکتسب ہے۔ خدا نے ان افعال کا ہونا چاہا۔ خدا نے جو خلق و اختراع کیا ہے وہ اس کا احسان ہے۔ خدا کو جائز ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف دے۔ خدا کو بے گناہوں کو عذاب میں مبتلا کرنے کا حق ہے۔ خدا پر مصلحت کی پابندی نہیں۔ واجب وہی چیز ہے جو شرع کی رو سے واجب ہے۔ انبیا کا مبعوث ہونا ممکن ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوت معجزات سے ثابت ہے۔

رکن چہارم - سمعیات (منقولات) جس کے اصول عشرہ یہ بیان کیے گئے ہیں۔ قیامت۔ قبر کا عذاب۔ میزان قیامت۔ پل صراط۔ بہشت و دوزخ کا وجود احکام امامت۔ صحابہ کی فضیلت، بترتیب خلافت۔ امامت کے شرائط۔ امام مشروط موجود نہ ہو تو سلطان وقت کے احکام کا اتباع۔

ماتریدیہ

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اہل سنت کے تمام فرقے عقائد کے اعتبار سے اشاعرہ کے مسلک سے وابستہ ہو گئے تھے لیکن ابتداء ہی سے احناف اپنے عقائد و اصول میں اشاعرہ سے اختلاف کرتے رہے۔ علامہ ابن الاثیر لکھتے ہیں کہ ''یہ نہایت تعجب کی بات ہے کہ کوئی شخص حنفی بھی ہو اور اشعری بھی ہو۔ اس لئے کہ احناف تو عقیدتاً امام ابو منصور ماتریدی ہی کے متبع رہے ہیں'' اور فرقہ ماتریدیہ انہی کی جانب منسوب ہے، جس کی تفصیل اور عقائد کی وضاحت حضرت امام ماتریدی کے حالات کے سلسلہ میں کتاب کے دوسرے حصہ میں آئے گی۔

(ماخذ-الملل و النحل۔ علم کلام۔ مقدمہ ابن خلدون۔
تاریخ الکامل۔ الفرق بین الفرق۔)

متکلمین کے چند دیگر فرقے

خوارج، روافض، معتزلہ، مرجئیہ اور اہل حق کے علاوہ بھی شہرستانی اور عبدالقاہر بغدادی نے چند دیگر کلامی فرقوں کے نام گنائے ہیں لیکن حقیقت میں انہیں علیحدہ فرقے کا نام دینا مناسب نہیں، کیونکہ بنیادی عقائد کے لحاظ سے ان میں سے ہر ایک کا تعلق مذکورہ بالا کسی نہ کسی کلامی فرقے سے ضرور نظر آتا ہے مثلاً

نجاریہ

حسین ابن محمد النجار کے متبعین کو کہتے ہیں جو بعض مسائل میں اہل سنت کی موافقت کرتے ہیں اور بعض میں قدریہ کے ساتھ ہیں۔صرف چند مسائل ایسے ہیں جن میں یہ منفرد ہیں جیسے ایمان میں زیادتی تو ہوتی ہے لیکن نقصان نہیں ہوتا۔

جہمیہ

جہم بن صفوان کے نام پر یہ فرقہ ہے، جو استطاعات کا منکر ہے اور اعمال میں جبر کا قائل۔نفی صفات میں یہ معتزلہ کے عقائد کا ساتھ دیتا ہے۔

کرامیہ

ابوعبداللہ بن محمد بن کرام کی طرف یہ فرقہ منسوب ہے جو بجستان سے بھاگ کر گرجستان چلے گئے تھے۔بعض مسائل میں یہ بھی اہل سنت کے ہم عقیدہ ہیں۔ لیکن صفات کے اثبات میں یہ اس حد تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ تجسیم کو درست مانتے ہیں۔

مشبہہ

عبد القاہر بغدادی نے مشبہہ کو دو صنفوں پر منقسم کیا ہے ایک وہ جو ذات باری تعالیٰ کو غیر کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں اور دوسرے وہ جو صفات باری کی تشبیہ صفات غیر کے ساتھ دیتے ہیں۔ ان دونوں فرقوں کی بھی مختلف جزوی شاخیں نکلتی ہیں جن میں سے بعض غالی رافضیوں سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً فرقہ سبائیہ جو حضرت علیؓ کی الوہیت کا قائل ہے۔

حضرت علیؓ کے سامنے جب چند افراد نے اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا تو حضرت علیؓ نے تادیباً و تہدیداً ان لوگوں کو آگ میں ڈلوادیا۔ لیکن ان کے بعد پھر بعض دوسرے افراد نے بھی اس عقیدے کا اظہار کیا اور یہ کہا کہ "آپ نے جو بعض افراد کو آگ میں جلوادیا تو اس سے ہمارا عقیدہ اور علم اس معاملہ میں اور زیادہ پختہ ہو گیا کہ آپ کی الوہیت برحق ہے کیونکہ آگ کا عذاب سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی اور نہیں دے سکتا"۔ اس طرح یہ بدبخت اپنے خیال اور عقیدے میں اور زیادہ پختہ ہو گئے۔

(ماخذ - الفرق بین الفرق - الملل و النحل)

❂❂❂❂❂

حصہ اول ختم شد

حصۂ دوم

عمرو بن عبید

۸۰ھ------۱۴۴ھ

نام ونسب

نام عمرو اور کنیت ابو عثمان۔ والد کا نام عبید اور دادا کا نام باب تھا۔ دادا کی طرف منسوب کرتے ہوئے ان کو ابن باب بھی کہا گیا ہے، جیسا کہ ذیل کے شعر سے ظاہر ہوتا ہے

برأت من الخوارج ولست منهم
من الغزال منهم و ابن باب

ترجمہ: میں خارجیوں سے بری ہوں اور ان میں سے نہیں ہوں بلکہ غزال اور ابن باب ان میں سے ہیں۔

ابن خلکان نے ان کو بنی عقیل عرادہ بن یربوغ کا مولی لکھا ہے۔ لیکن عبد القاہر بغدادی نے مولی بن تمیم بتایا ہے۔ خطیب نے لکھا ہے کہ ان کے دادا ''باب'' فارس کے قیدیوں میں تھے اور آل عرادہ کے غلام تھے لیکن بعد میں بنی تمیم میں منتقل کر دئے گئے اور بنو تمیم نے ان کو آزاد کر دیا۔ اس لئے مولی بنو تمیم کہے گئے، کیونکہ حق ولاء اس کو ملتا ہے جو آزاد کرتا ہے۔ اور غالباً اوپر کی مختلف روایتوں میں تطبیق کی یہی صورت سب سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔

خاندانی حالات

عمرو کے دادا تو قیدیوں میں سے تھے ہی ان کے والد بھی قیدیوں میں سے تھے۔ یہ سجستان میں گرفتار کئے گئے تھے اور ان کا پارچہ بافی کا پیشہ تھا۔ یہ آزاد ہو کر موال میں ممتاز ہوئے اور اصحاب شرط میں شامل ہو گئے۔ ان کی مستقل سکونت 'بصرہ'

میں تھی لیکن اصحاب شرط کے تعلق سے کوئی ایسی بات پیش آئی کہ یہ شہر میں نیک نام نہ ہو سکے اور معاشرہ میں بھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھے گئے۔ یہاں تک کہ جب لوگ عمرو کو ان کے ہمراہ دیکھتے تو کہتے کہ ''کیا ہی نیک انسان ہے لیکن کیسے شخص کی اولاد ہے'' اور یہ بات سن کر خود عبید کی زبان پر اکثر یہ جملہ آجاتا ''میری مثال آزر کی ہے اور اس کے بچے ابراہیم جیسی۔

پیدائش ووطن

جیسا کہ اوپر گزرا عبید ابن باب کی سکونت بصرہ میں تھی۔ عمرو بصرہ ہی میں ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور اس نسبت سے عمرو بصری کہلائے۔

ابتدائی تعلیم اور ان کے اساتذہ

عمرو بن عبید کی ابتدائی تعلیم کا حال کسی مورخ نے نہیں لکھا ہے البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی تعلیم کے لئے انہوں نے مختلف علوم کی تحصیل شروع کی۔ فن حدیث کی تحصیل کے لئے حضرت حسن بصریؒ کے حلقۂ درس میں زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اسی طرح ابوقلابہ بھی ان کے اساتذہ حدیث میں سے ہیں۔ درمیان درس حضرت حسن بصریؒ سے بعض کلامی مسائل میں اختلاف ہوا تھا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اسی وقت یہ حضرت حسن بصریؒ کی مجلس سے اٹھ گئے۔ اور مسجد کے ایک گوشہ میں اپنا حلقۂ درس قائم کر لیا۔ ان کے علم وفضل کی شہرت ہو چکی تھی اس لئے تلامذہ کا ایک گروہ ان کے گرد جمع ہو گیا۔

تلامذہ

اگرچہ اصحاب سیر نے ان کے تلامذہ کی مکمل فہرست اپنی اپنی کتابوں میں درج نہیں کی ہیں لیکن مختلف کتابوں میں مختلف راوی ایسے ہیں جنہوں نے ان سے روایتیں نقل کی ہیں، جن میں بعض اپنے دور کے ائمہ وشیوخ فن حدیث شمار کئے جاتے

ہیں۔ چنانچہ شعبہ، یحیٰی قطان، حماد، عبد الوارث، عبد الوہاب ثقفی، علی بن عاصم، ابن جریج، سفیان بن عینیہ، سفیان بن حسین اور یحیٰی بن سعید وغیرہ جیسے ماہرین فن حدیث ان کے حلقہ بگوش رہے ہیں۔

اعتزال کی ابتداء

عمرو بن عبید مشائخ معتزلہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مذہب اعتزال کی ابتدا اور معتزلین کی جماعت میں شامل ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ واصل بن عطا (جو بانی مذہب اعتزال مانے جاتے ہیں) اور عمرو بن عبید ابتداء حضرت حسن بصریؒ کی مجلسوں میں بیٹھا کرتے تھے۔ جب گناہ کبیرہ کے مرتکب پر حکم لگانے کے سلسلے میں اختلاف ظاہر ہوا اور خوارج کہنے لگے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے لیکن دوسری جماعت نے کہا گناہ کبیرہ کا مرتکب فاسق ہے اور مومن بھی تو واصل بن عطا نے دونوں عقیدوں میں سے کسی کو تسلیم نہ کرتے ہوئے ایک نئے عقیدہ کا اظہار اس طرح کیا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ کافر ہے نہ مومن بلکہ ان دونوں درجوں کے درمیان ایک درمیانہ درجہ ہے یعنی "منزلة بين المنزلتين"۔

چنانچہ حضرت حسن بصریؒ نے انہیں اپنی مجلس سے نکل جانے کا حکم دے دیا اور یہ دونوں ان کی مجلس سے الگ ہو کر بصرہ ہی کی مسجد کے ایک گوشہ میں بیٹھنے لگے۔

دربار خلافت میں قدر و منزلت

عمرو بن عبید خلیفہ منصور کی خلافت سے قبل اس کے مصاحبوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا اور ان ہی لوگوں کے ساتھ دن رات گزارتا تھا۔ لیکن منصور کے خلیفہ ہونے کے بعد دربار خلافت میں آمد و رفت کم ہوگئی۔ ایک روز اتفاقاً دربار خلافت میں پہنچے تو خلیفہ منصور نے ان کو اپنے پاس بٹھا کر کچھ نصیحت کرنے کی درخواست کی۔ عمرو

بن عبید نے سورہ الفجر اس کے سامنے پوری پوری تلاوت کی اور آخر میں کہا ''یا ابی جعفر ان ربک لبا لمرصاد '' خلیفہ پر اس کے سنتے ہی اس شدت کا گریہ طارہ ہوا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خلیفہ نے آج پہلی مرتبہ مذکورہ سورت سنی ہے۔ جب شدت گریہ میں کمی آئی تو خلیفہ نے مزید اور نصیحت کی درخواست کی تو عمرو بن عبید نے کہا'' یہ امارت وخلافت جس کے تم آج مالک ہو کل تمہارے علاوہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہوگی، جس طرح تم سے پہلے یہ امارت کسی دوسرے کے ہاتھ میں تھی۔ اس لئے تم اس دن سے ڈرتے رہو جس کے بعد کوئی رات آنے والی نہیں ہے۔'' (یعنی قیامت کے دن کا خیال رکھو کہ اس دن تمہاری زیادتیوں اور ناانصافیوں کا حساب ہوگا) اس کے بعد عمرو بن عبید نے چند عبرت اور رقت آمیز اشعار پڑھے جنہیں سن کر خلیفہ پھر گریہ وزاری میں مبتلا ہوگیا۔ جب عمرو بن عبید نے جانے کا ارادہ کیا تو منصور نے ان سے کہا کہ ''میں نے آپ کی خدمت میں دس ہزار دراہم پیش کرنے کا حکم دے دیا ہے''۔ عمرو بن عبید نے جواب دیا کہ ''مجھے اس کی ضرورت نہیں''۔ منصور نے زور دے کر کہا کہ ''تمہیں خدا کی قسم ہے اسے قبول کرلو''۔ لیکن اس کے جواب میں عمرو نے بھی دراہم نہ لینے کی قسم کھالی۔ منصور کا لڑکا مہدی بھی اس وقت موجود تھا اسے دونوں کی گفتگو نے اور پھر عمرو بن عبید کی جانب سے دراہم کے قبول نہ کرنے پر سخت تعجب میں ڈال دیا، اس لئے کہ وہ ایسا دور تھا کہ جس میں لوگ خلیفہ وقت کے ہر جائز و ناجائز خواہشات اور احکام کی اتباع اپنے لئے باعث فخر و سعادت سمجھتے تھے اور اسی عمل کو نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ مہدی نے بھی اسی ماحول میں پرورش پائی تھی۔ وہ خلیفہ کے ہر حکم پر آمنا وصدقنا سنتے سنتے جرأت انکار کا تصور ہی فراموش کر چکا تھا۔ اسے یہ خیال بھی نہیں تھا کہ کوئی شخص خلیفہ وقت کے حکم سے سرتابی بھی کرسکتا ہے۔ چنانچہ اس نے تعجب بھرے لہجے میں عمرو بن عبید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا خلیفہ نے قسم کھائی تھی پھر تم نے کیوں قسم کھائی؟ اب اپنی قسم کو تم میں سے کون توڑے گا تم یا خلیفہ؟ عمرو بن عبید نے

مہدی کی باتوں کو سن کر خلیفہ سے اس کے متعلق دریافت کیا تو منصور نے مہدی کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ میرا لڑکا اور ولی عہد سلطنت ہے۔ عمرو بن عبید نے تعارف کے بعد چند جملوں میں مہدی کی زہانت کی تعریف وتوصیف کی اور مہدی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''اے بھتیجے! جب تمہارے باپ اور چچا دونوں ہی نے ایک دوسرے کی مخالفت میں قسم کھائی تو چونکہ تمہارا باپ کفارہ ادا کرنے پر زیادہ قادر ہے اور تمہارے چچا کی بہ نسبت زیادہ ذی حیثیت بھی ہے اس لئے اسے ہی اپنی قسم توڑ کر کفارۂ قسم ادا کرنا چاہئے''

منصور نے اس شدت انکار کے باوجود بھی عمرو بن عبید سے پوچھا کہ کیا تمہیں ان دراہم کی قطعی ضرورت نہیں ہے؟ تو عمرو بن عبید نے جواب دیا کہ ''ہاں مجھے اس کی بالکل ضرورت نہیں، اس کو میرے پاس نہ بھیجو۔ اگر مجھے اس کی ضرورت ہوگی تو میں خود آ کر لے جاؤں گا''۔ منصور نے پھر دریافت کیا ''اگر تم میرے پاس نہ آؤ تو؟'' عمرو نے جواب دیا ''میرا نہ آنا میرے عدم ضرورت کی دلیل ہوگی''

عمرو بن عبید جب خلیفہ سے رخصت ہو کر چلے تو خلیفہ انہیں الوداع کہنے کے لئے محل کے باہر آئے اور شعر کا ایک بند ان کی تعریف میں کہا جو یہ ہے

کلکم یمشی روید- کلکم یطلب صید- **غیر عمرو بن عبید**

(ترجمہ: تم میں سے ہر ایک آہستہ آہستہ چلتا ہے اور تم میں سے ہر ایک شکار کی تلاش میں رہتا ہے، سوائے عمرو بن عبید کے)

عمرو بن عبید کو ایک خصوصیت یہ بھی حاصل ہوئی کہ جب ان کا انتقال ہوا تو خلیفہ منصور نے ان کی وفات پر مرثیہ کہا۔ حالانکہ کسی دوسرے شخص کی وفات پر یا کسی کی تعریف میں اس نے ایک شعر بھی نہیں کہا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ عمرو بن عبید سے انتہائی عقیدت رکھتا تھا۔ اس کے مرثیہ کے مندرجہ ذیل اشعار سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے

صلی اللہ علیہ من متوسد   قبر امررت بہ علی مروان

سونے والے تم پر خدا کی رحمت ہو

مروان میں واقع ایک قبر کے پاس سے گزرتا ہوں تو کہا کرتا ہوں

قبر اتضمن مومنا متحفنا   صدق اللہ لہ و دابالعریان

وہ ایسی قبر ہے جو ایک مومن کا گہوارہ ہے

اللہ نے سچ فرمایا ہے کہ جب عربوں پر اس کی رحمت کی بارش ہوتی تھی

لو ان ھذا لدھر ابقی صالحا   ابقی لنا عمرا با عثمان

اگر یہ زمانہ کسی نیک آدمی کو بقائے دوام عطا کرتا

تو ہمارے لئے ابوعثمان عمرو بن عبید کو زندہ اور باقی رکھتا۔

میدان جنگ میں

جب محمد بن عبداللہ بن حسن بن حسین بن علی بن ابی طالب نے ابوجعفر منصور خلیفہ بغداد کے مقابلہ میں خروج کیا اور بصرہ سے بھی آگے جنگ کی غرض سے بڑھے تو اس کی خبر خلیفہ منصور کو پہنچی۔ اس نے ۱۴۲ھ میں ان کے مقابلہ کے لئے فوج بھیجی، جس میں عمرو بن عبید باوجود اپنی پیرانہ سالی اور ضعیفی کے ہمراہ تھے۔ جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں میدان جنگ سے کتنی دلچسپی تھی۔ اور فلسفہ کی گتھیوں کے علاوہ میدان کارزار میں تلواروں کی جھنکار کے بھی وہ متمنی تھے اور ضرورت پڑنے پر شمشیر و سنان کے کھیل سے منہ موڑنا نہیں جانتے تھے بلکہ سینہ سپر ہو کر جواں مردی سے حادثات زمانہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔

عقائد

عمرو بن عبید عقیدے کے اعتبار سے واصلی تھے، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ مختصراً اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو خارجیوں کی طرح

خلود فی النار کا مستحق تو قرار دیتے ہیں مگر ان کو مومن مانتے ہیں اور نہ مشرک یا کافر۔ چنانچہ اسی بناء پر ایک مشہور شاعر اسحاق بن سوید عدوی نے انہیں خارجی کہا ہے۔ عمرو بن عبید نے فرقہ واصلیہ کے چوتھے اصول سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ اصحاب جنگ جمل فاسق تو ہیں لیکن فاسق عینی نہیں۔ برخلاف اس کے دیگر اصحاب واصل بن عطاء یہ کہتے ہیں کہ اصحاب جنگ جمل میں سے ایک فریق غلطی پر تھے لیکن انہیں مخطئ عینی نہیں کہا جائے گا۔ ہاں ان دونوں جماعتوں میں سے کسی کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی۔ مگر اس سے عمرو بن عبید یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ شہادت کا قبول نہ کرنا ان کے فسق پر دلالت کرتا ہے اس لئے کہ سوائے فاسق کے اور کسی کی شہادت رد نہیں کی جاتی ہے۔ لہذا فریق اول اور فریق ثانی دونوں فاسق ہوئے اور فاسقوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور اس پر غضب یہ کیا کہ خلود فی النار کا اضافہ بھی کر دیا (نعوذ باللہ من ذالک) حالانکہ اس جنگ میں ہزاروں صحابہؓ اور خاص کر پچیس ایسے ذی عظمت صحابہ بھی تھے جو نبی کریم ﷺ کے ہمراہ مختلف غزوات میں شریک ہو چکے تھے، جن میں چھ سو انصاری صحابہ اور مہاجرین اولین کی ایک جماعت بھی شامل جنگ جمل تھی، جنہیں جنتی ہونے کی بشارت خود نبی کریم ﷺ نے دی تھی۔

مخالفت

لوگوں کی عمرو بن عبید سے مخالفت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ان کا مذہبی عقیدہ ہی کچھ اس طرح کا تھا کہ وہ ان کے لئے طرح طرح کی مخالفتوں کا سبب بنا۔ حد تو یہ ہے کہ اصحاب سیر جہاں ان کو عابد و زاہد، متقی پرہیز گار لکھتے ہیں وہیں ان کو کاذب اور افترا پرداز بھی لکھنے سے گریز نہیں کرتے ہیں۔ اہل علم اور محدثین کے نزدیک بھی یہ ثقہ راوی میں شمار نہیں کئے جاتے ہیں۔ زندگی میں تو طرح طرح کی مخالفتیں ہوتی ہی رہیں، ان کے مرنے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ وفات کے بعد بھی عجیب عجیب روایتیں ان کے عذاب بعد الممات سے متعلق بیان کی گئیں۔

اور غالباً یہ سب اس لئے ہوا کہ عوام الناس کہیں ان کے عقائد کی پیروی نہ کرنے لگیں۔
اس لئے کہ ان کی فصاحت و بلاغت، اسلوب بیان اور انداز تقریر اتنا موثر تھا کہ مخالفین بھی ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے تھے۔ ان کے دلائل قطعی کی کاٹ معاندین کے پاس بھی نہیں ہوتی تھی۔ معاندین بھی ان کے جادو بیانی اور شیریں کلامی سے مسحور ہو جاتے تھے جیسا کہ ذیل کے واقعے سے ظاہر ہوتا ہے۔

عمر بن عبد العزیز جب عراق کے امیر متعین ہوئے تو انہوں نے بصرہ میں اپنا عامل شبیب بن شیبہ کو بنا کر بھیجا اور اسے تاکید کی کہ ایسے لوگوں کے پاس علماء حق کے وفود بھیجے جائیں جو عقیدے کے اعتبار سے مذہب اعتزال کی پیروی اور اشاعت کرتے ہیں تا کہ وہ علماء انہیں ایسا کرنے سے روک دیں۔ چنانچہ شبیب نے عمرو بن عبید کے پاس بھی ایک وفد بھیجا جو بحث و مباحثہ کے بعد خالی ہاتھ لوٹ آیا اور انہیں مذہب اعتزال کی اشاعت و پیروی سے نہ روک سکا۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا کہ ایک مشہور شاعر اسحاق عددی نے انہیں خارجی تک کہہ دیا، لیکن درحقیقت یہ عقیدے کے اعتبار سے خارجی نہیں تھے۔ محض اصول کی مطابعت کسی کا دین یا مذہب نہیں بدلتی ہے۔ اور جب ان کی جماعت ایک علیحدہ جماعت تسلیم کر لی گئی تو پھر اسے کسی دوسری جماعت میں ضم کرنے کی کوشش ایک حد تک مذموم ہی سمجھی جائے گی۔ اختلاف اپنی جگہ پر ہے لیکن ان کے ساتھ ساتھ واقعات و حالات کی صحت کا التزام بھی ضروری ہے۔ مگر ذیل کے شعر میں صحیح واقعہ کی طرف اشارہ قطعی نہیں ملتا ہے۔

برئت من خوارج ولیست منهم من الغزال منهم و ابن باب

(ترجمہ: میں نے خارجیوں سے برأت حاصل کر لی
اور میں ان میں سے نہیں ہوں۔ بلکہ غزال اور ابن باب ان میں سے ہیں)

بات یہیں پر نہیں رکی بلکہ یحیٰ ابن معین نے تو انہیں دہریہ تک کہہ دیا ہے۔

علم و فضل

عمرو بن عبید کی تصنیف کردہ کتابوں میں سے کوئی کتاب دستیاب نہیں ہو سکی اس لئے علم و فضل اور کمال کا صحیح اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی کتب تاریخ و سیر میں کچھ ایسے واقعات ضرور ملتے ہیں جو ان کی علمی صلاحیت کی برتری کے ثبوت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ان کے حالات کے ضمن میں اکثر مورخوں نے لکھا ہے کہ یہ مفسیر بھی تھے اور کلام اللہ کے احکام کی تشریح کیا کرتے تھے۔ چنانچہ داؤد بن ابی ہند نے ان سے اعتراضاً یہ بات کہی کہ آپ قرآن کریم کی تفسیر اپنی رائے سے کیا کرتے ہیں اس لئے میں آپ کی مجلسوں میں شرکت نہیں کرتا ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ اگر میں حرام کو حلال اور حلال کو حرام اپنی مرضی سے بناتا تو آپ کا اعتراض یا میری مجلسوں میں شرکت نہ کرنا درست ہوسکتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی برتری کا احساس خود حضرت حسن بصریؒ کو بھی تھا۔ انہوں نے مختلف مواقع پر اس کا اقرار بھی کیا ہے۔ ایک بار انہوں نے عمرو بن عبید کو دیکھا تو سفیان سے کہا کہ یہ شخص اگر احادیث کی روایت کرتا تو بصرہ کے نوجوانوں کا سردار ہوتا یعنی علمی اعتبار سے اسے سبھوں پر فوقیت حاصل ہوتی۔

ایک خصوصیت انہیں یہ بھی حاصل تھی کہ یہ بھی مخالف سے گفتگو فرماتے تو نہایت مختصر لفظوں میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کی کوشش کرتے اور نہ صرف یہ کوشش کرتے بلکہ اس میں سو فی صد کامیاب بھی رہتے۔ انہیں اکثر اپنی اس صفت پر فخریہ گفتگو بھی کرتے سنا گیا۔

زہد و ورع

تقریباً تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ عمرو بن عبید عابد و زاہد تھے۔ خدا کا خوف ان کے دل میں بیٹھ چکا تھا۔ اور وہ اللہ کو حیات و موت کا مالک سمجھتے تھے اور اس کی رضا جوئی کو سب سے اولین فرض خیال کرتے تھے جس کا ایک ثبوت تو ان کی وہ دعا ہے جو انہوں نے اپنی موت سے کچھ قبل پڑھی تھی، جسے آگے چل کر اس

کتاب میں آپ پڑھیں گے۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے ایسی دعائیں اور التجائیں بارگاہ ایزدی میں پیش کی ہیں جن کے الفاظ اور معانی پر غور کرنے سے اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ عمرو بن عُبید دنیوی مال و دولت اور جاہ وحشمت کو قطعی خاطر میں نہیں لاتے تھے بلکہ صرف اللہ کی خوشنودی ہی ان کے لئے سب سے بڑی دولت تھی۔ چنانچہ ہم ان کو اللہ کی بارگاہ میں ان الفاظ سے دعا مانگتے ہوئے دیکھتے ہیں

اللھم اغننی بالا فتقار الیک و لاتفقرنی بالاستغناء عنک

اللھم اعنی عن الدنیا بالقناعة و علی الدنیا بالعصمة—

(ترجمہ: اے اللہ مجھے اپنا محتاج بنا کر ساری دنیا سے بے نیاز کر دے۔

اپنی ذات سے بے نیاز کر کے مجھے دنیا کا محتاج نہ بنا۔

اے اللہ دنیا کے مقابلے میں تو قناعت اور پاک دامنی کے ذریعہ میری مدد فرما)

خلیفہ منصور کے دس ہزار درھم کو ٹھکرا دینے اور اس کے سامنے کبھی دست سوال دراز نہ کرنے میں بھی زہد وورع ہی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اور غالباً اس وقت دولت وثروت کے مقابلہ میں فقر و فاقہ ہی کو ترجیح دینا مقصود تھا۔ چنانچہ اسی حیثیت سے ان کا مرتبہ بلند ہے کہ انہوں نے دنیا کو لات ماردی اور اپنے اعمال سے الدنیا جیفة کی صحیح ترجمانی وتشریح پیش کی۔

وفات

عمرو بن عبید مکہ مکرمہ سے لوٹتے ہوئے راستہ ہی میں صاحب فراش ہو گئے اور حالت اس قدر نازک ہوگئی کہ زیست کی کوئی امید نہ رہی، چنانچہ وفات کا وقت اور قریب آیا تو انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میری موت کا وقت قریب ہے اور میں اس سے بچ نہیں سکتا اس کے بعد انہوں نے یہ دعا پڑھی:

اللھم انک تعلم انه لم یسخ امران لک فی احداھما مرضی

ولی فی الآخر ھو الاثرات رضاک علی ھوائی فاغفرلی.

(اے اللہ تو جانتا ہے کہ تیرے معاملہ میں دو باتوں میں کبھی نرمی یا سستی نہیں برتی گئی ایک تو اپنی مرضی کو ترجیح دینے دوسرے اپنی خواہشات کو تیری مرضی پر

مقدم سمجھنے میں اس لئے میری مغفرت فرما) اس دعا کے بعد انہوں نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

تاریخ وفات

عمرو کی وفات کی تاریخ اور سال کے سلسلہ میں راویوں کے درمیان بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ خطیب بغدادی نے اپنی کتاب میں علاحدہ علاحدہ راویوں کے اقوال اس باب میں درج کئے ہیں لیکن اپنی کوئی رائے نہیں دی ہے۔ ابن خلکان نے بھی اس سلسلہ کے مختلف بیانات درج کئے ہیں لیکن راویوں کا حوالہ دینے سے گریز کیا ہے۔

خطیب بغدادی کی تحقیقات کو دیکھنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کی وفات ۱۴۴ھ میں ہوئی۔ اس لئے کہ مورخین کی اکثریت اسی قول کے حق میں ہے۔ بقیہ چند لوگوں نے ان کی وفات ۱۴۲ھ یا ۱۴۳ھ یا ۱۴۸ھ میں بتائی ہے۔

مقام وفات

مکہ مکرمہ سے لوٹتے ہوئے ایک مقام ''مران'' میں عمرو صاحب فراش ہوئے اور وہیں انہوں نے وفات بھی پائی۔

تصنیفات

عمرو بن عبید کی تصنیف کردہ کتابوں میں سے درج ذیل کتب کا تذکرہ ابن خلکان نے کیا ہے:

(۱) کتاب التفسیر عن الحسن بصریؒ (۲) کتاب الرد علی القدریۃ

ان کے علاوہ بہت سے خطبات و رسائل اور عدل و توحید سے متعلق اقوال کثیرہ بھی بقول ابن خلکان اپنی یادگار کے طور پر چھوڑے ہیں۔

(ماخذ: تاریخ بغداد۔ البیان والتبیین جلد اول۔ وفیات الاعیان۔ الفرق بین الفرق۔ میزان الاعتدال۔ کتاب الکنی والاسماء۔ الملل والنحل۔ البیان والتبیان)

واصل بن عطاء

۸۰ھ------۱۸۱ھ

نام ونسب

واصل نام، ابوحذیفہ کنیت اور غزال لقب تھا۔ یہ عطا کے بیٹے تھے۔ اس سے اوپر کے حالات پردۂ خفا میں ہیں۔

ولادت

واصل کی پیدائش مدینہ منورہ میں ۸۰ھ مطابق ۶۹۹ء میں ہوئی۔ مورخین نے انہیں بنوضبہ کا غلام لکھا ہے۔ اور بعضوں نے مولیٰ بنومخزوم بھی کہا ہے۔ یہ ہرن پالتے تھے اس لئے ان کا لقب غزال پڑ گیا۔ لیکن جاحظ نے اس قول کی سختی سے مخالفت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غزال کا جو یہ مفہوم لوگوں نے لیا ہے وہ غلط ہے بلکہ حقیقت صرف یہ ہے کہ یہ ہرنیوں کی خرید وفروخت کے بازار میں بہت زیادہ بیٹھا کرتے تھے تاکہ وہاں پاکباز عورتیں ان کی جانب مائل ہوں۔ چنانچہ اسی وجہ سے ان کا لقب غزال پڑ گیا۔

واصل کی گردن بہت لمبی تھی جو کہ معیوب معلوم ہوتی تھی چنانچہ اس کا تذکرہ بشار بن برد نے اپنے اشعار میں بھی کیا ہے۔

اساتذہ

واصل کی ابتدائی تعلیم کا حال معلوم نہیں البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ علم حدیث اور دیگر علوم وفنون کی تکمیل حضرت حسن بصریؒ سے کی۔

بناء مذہب اعتزال

جیسا کہ میں نے عمرو بن عبید کے حالات کے ضمن میں لکھا ہے کہ مذہب اعتزال کے قیام کی بنیادی وجہ واصل بن عطا کا حضرت حسن بصری سے عقیدتاً اختلاف تھا۔ جب انہوں نے جبر وقدر اور منزلة بين المنزلتين کے عقیدے کا اظہار کیا تو ابتداء میں ان کے دست راست عمرو بن عبید نے بھی ان کی مخالفت کی اور دونوں کے درمیان زبردست مناظرے بھی ہوئے۔ عمرو بن عبید اس میں شکست کھا گئے۔ اس کا اثر عمرو بن عبید پر اس قدر پڑا کہ وہ واصل کے عقائد کے سب سے بڑے حامی ہو گئے اور دونوں حضرت حسن بصری کی مجلس سے ایک ساتھ الگ کر دئے گئے۔ جس کے بعد دونوں نے اسی مسجد کے ایک گوشہ میں علاحدہ درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، جسے دیکھ کر حسن بصری کے کسی شاگرد نے ان کی جانب اشارہ کر کے کہا کہ اعتزل عنا یعنی ہم لوگوں سے یہ الگ ہو گئے۔ یہی اعتزل عنا کے الفاظ نے بعد میں چل کر اصحاب، واصل وعمرو بن عبید کے لئے باضابطہ ایک نام کی شکل اختیار کر لی اور اس طرح دونوں اور دونوں کے پیرو کار معتزلہ اور معتزلین کہلانے لگے۔ چنانچہ اسی حیثیت سے بانی مذہب اعتزال واصل بن عطا ہی کو تصور کیا جانے لگا۔

عقائد

واصل بن عطا کے نام کی مناسبت سے ان کے عقائد کی اتباع کرنے والوں کو واصلیہ کہا جانے لگا۔ اور اسے ایک خاص فرقہ قرار دے کر اس کے عقائد کے چار مندرجہ ذیل اصول بیان کئے گئے ہیں:

اصول اول: اس اصول کے ذریعہ اللہ کی مخصوص صفات مثلاً علم، قدرت، ارادہ اور حیات کی نفی کی گئی ہے۔ ابتدا میں اس عقیدے نے ٹھوس شکل اختیار نہیں کی تھی لیکن واصل بن عطا ہی نے اسے تقویت بخشی۔

اصول دوم تقدیر کے مسئلہ میں علماء متقدمین میں اور اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ حکیم اور عادل ہے، وہ کسی کے ساتھ برائی اور ناانصافی نہیں کرتا۔ بلکہ انسان ہی اپنی بھلائی و برائی، کفر و ایمان، اطاعت و معصیت کا ذمہ دار ہے۔ لیکن اس فرقہ کا یہ اصول بتاتا ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے وہ اللہ کے حکم اور اس کے دباؤ میں آکر کرتا ہے وہ مجبور محض ہے۔ اس کا اس معاملہ میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس اصول کے مطالعہ سے فرقہ واصلیہ کے جبر و قدر کے عقیدے کا علم ہوتا ہے۔ اسی راہ پر معبد جہنی اور غیلان دمشقی بھی چلے اور انہوں نے بھی اس خیال کو تقویت بخشی۔

اصول سوم اس اصول کے ذریعہ یہ بتایا گیا ہے کہ اگر انسان گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو تو وہ نہ کافر ہوگا اور نہ مومن بلکہ اسے دونوں درجوں کے درمیان ایک تیسرا درجہ تسلیم کر کے اس میں رکھنا پڑے گا۔ ایسا درجہ جو نہ تو حدود ایمان میں داخل ہو اور نہ اس پر کفر کا اطلاق ہو۔

اصول چہارم فرقہ واصلیہ نے اپنے اس اصول کے ذریعہ اصحاب جنگ جمل کو گناہ گار قرار دیا ہے۔ ان کے اس اتہام سے حضرت علیؓ اور ان کے ہمراہی یا حضرت طلحہ، زبیر اور حضرت عائشہ صدیقہ میں سے کوئی بھی نہ بچ سکا۔

علم و فضل

واصل بن عطاء کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے کلام میں ایسے الفاظ استعمال کرنے سے بالکل پرہیز کرتے تھے جن میں "ر" ہو۔ ان کی پوری کی پوری تقریر ایسے الفاظ پر مشتمل ہوتی تھی جس میں "ر" کا استعمال نہیں ہوتا تھا۔ ان کی اس خصوصیت پر اکثر اہل علم و ادب تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس التزام کی وجہ سے بیان میں غیر معمولی طوالت پیدا ہو جاتی تھی جس کی وجہ کر عبارت بھی ثقیل ہو جاتی تھی۔ پھر بھی ان کی یہ خصوصیت ان کے علمی مرتبوں کو علم و ادب کی مجلسوں میں بڑھانے میں معاون ثابت ہوئی۔ اسی بناء پر شعراء نے بھی ان کی

تعریفیں کیں۔ چنانچہ ایک معتزلی شاعر ابو الطریق الضبی نے ان کی مدح میں جو قصیدہ کہا ہے اس میں بھی ان کی اس خصوصیت کا تذکرہ ملتا ہے۔

بشار بن برد کے حوالہ سے ایک عربی عبارت اس سلسلہ میں پیش ہے جس کے مطالعہ سے ان کی قادر الکلامی اور علمی صلاحیت کی بلندی کا علم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں کہیں بھی لفظ ''ر'' کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ مفہوم عبارت واضح ہے بلکہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی عبارت اعلیٰ درجہ کی شمار کی جا سکتی ہے۔

''اما لهذا لا عمی المکتنی بابی معاذ من یقتله اما و الیه لو لا ان الغیبة الخلق من اخلاق الغالیة لبعث الیه من یبعج بطنه علی مضجعه ثم لایکون لا سد وسیا و لا عقیلیا''

عبارت بالا کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ واصل بن عطاء نے بشار یا ابن برد یا ضریر کہنے کے بجائے لفظ اعمیٰ استعمال کیا ہے۔ اسی طرح مغیر یہ یا منصوریہ کے بدلے اخلاق الغالیہ استعمال کیا۔ آگے چل کر لبعث استعمال کیا مگر ارسلت نہیں۔ اسی طرح مضـــجـــعـــه کی عبارت لائی نہ کہ مرقدہ۔ یبقر کی جگہ تبج استعمال کیا۔ عبارت مذکورہ میں عقیلیا ہے جو بنوعقیل کی جانب مشیر ہے اور بنی عقیل سے مراد بشار ہیں اس لئے کہ وہ بھی اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔

واصل بن عطاء کی اس صفت کا تذکرہ جیسا کہ میں نے تحریر کیا مختلف شعراء نے بھی کیا ہے۔ ان ہی شعراء میں سے ایک ابو محمد خازنی نے بھی صفت مذکورہ میں واصل بن عطاء کے کمال کی تعریف کی ہے اور اس صفت کے ان پر اختتام کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو اس شعر کا ترجمہ:

ہاں راکے استعمال سے پرہیز کرو مگر بخشش کے دن سے پرہیز نہ کرو جس طرح ابن عطاء حرف را کے استعمال سے پرہیز کرتا ہے۔ اٹک اٹک کر پڑھو اگر چہ اس کے

لئے واصل کی موجودگی کافی ہے تاکہ اس را کو سنا جائے جسے واصل نے ساقط کر دیا ہے۔

اقوال

جاحظ نے واصل بن عطاء کے دو اقوال بھی نقل کئے ہیں جو ان کی حقیقت بیان تدبر اور راضی برضائے الٰہی رہنے پر دلالت کرتے ہیں۔

قول اول **کن فی الفتنة کابن لبون لاظهر فیرکب ولالبن فیحلب**

فتنہ کے زمانہ میں ابن لبون کی طرح رہو کہ نہ تو اس پر سواری کی جا سکتی ہے اور نہ اسے دوہا جا سکتا ہے۔

قول دوم **المومن اذاجاع صبر و اذا شبع شکر**

مومن وہ ہے کہ جب بھوکا ہو تو صبر کرے اور جب سیری حاصل ہو تو شکر کرے۔

وفات

واصل بن عطاء کی وفات ۱۸۱ھ میں ہوئی۔

تصنیفات

واصل کی تصنیفات میں سے درج ذیل کتابوں کا تذکرہ وفیات الاعیان اور فوات الوفیات میں موجود ہے:

کتاب اصناف المرجئة- کتاب فی التوبة- کتاب فی المنزلة بین المنزلتین- کتاب خطبة التی اخرج منها الراء- کتاب معانی القرآن- کتاب الخطب فی التوحید و العدل- کتاب ماجری بنیه و بین عمرو بن عبید- کتاب السبیل الی معرفة الحق- کتاب فی الدعوة- کتاب طبقات اهل العلم و الجهل-

(ماخذ: وفیات العیان، البیان و التبیین، حاشیة البیان و التبیین، الملل و النحل، الفرق بین الفرق، وفوات الوفیات)

بشر بن غیاث مریسی

متوفی ۲۱۹ھ

نام ونسب

بشر نام، ابوعبدالرحمن کنیت۔ والد کا نام غیاث اور دادا کا نام ابو کریمہ تھا

وطن اور خاندانی حالات

بشر مریس کے رہنے والے تھے۔ مریس کے متعلق ابن خلکان نے لکھا ہے کہ یہ مصر کا ایک قریہ ہے۔ اس لئے بعض لوگوں نے بشر کو مصر کی جانب بھی منسوب کیا ہے۔ لیکن صاحب جواہر المضیۃ نے لکھا ہے کہ بغداد کا ایک محلہ درب مریس کے نام سے ہے اور بشر اسی محلہ میں قیام پذیر تھے اس لئے انہیں مریسی کہا گیا۔ لہذا جن لوگوں نے ان کو مصر کی جانب منسوب کیا ہے یہ صحیح نہیں ہے۔ ان کے والد غیاث کا قیام کوفہ میں تھا۔ اور وہ وہاں رنگ سازی کا کام کیا کرتے تھے۔

ابتدائی تعلیم اور اساتذہ

بشر ابتدائی تعلیم وتربیت کی خاطر حضرت امام شافعیؒ کے حوالہ کئے گئے، لیکن جب بشر نے اپنے اختلافی عقائد کا اظہار کیا تو ان کے والد نے انہیں حضرت امام شافعیؒ سے علیحدہ کر دیا۔ علم فقہ کی تکمیل انہوں نے حضرت امام ابو یوسف سے اور علم حدیث حماد بن سلمٰی اور سفیان بن عیینہ سے کی۔ امام ابو یوسف سے بھی انہوں نے حدیث پڑھی ہے۔

تلامذہ

بشر کے شاگردوں میں صرف ایک نام حسین نجار کا آتا ہے، جنہوں نے علم کلام میں ان کی شاگردی اختیار کی تھی۔

عقائد

بشر عقیدے کے اعتبار سے فرقہ مرجئیہ سے تعلق رکھتے تھے، لیکن اس جماعت کے عقائد کے بعض پہلو سے بشر کو اختلاف تھا، چنانچہ بشر نے ان اختلافات کو ظاہر کیا جو عقیدے سے متعلق تھے تو ایک نیا فرقہ وجود میں آیا جس کا نام مریسیہ پڑ گیا۔ اس فرقہ کو محض ان کی یعنی بشر کی جماعت کہا جاتا ہے اس لئے کہ یہ جماعت صرف بشر کے عقیدے کی اشاعت کے لئے وجود میں آئی تھی۔ ان کے عقائد مختصراً یہ ہیں:

ایمان تصدیق بالقلب واللسان دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اور کفر انکار کو کہتے ہیں۔ قرآن مخلوق ہے۔

اس عقیدے کی شروعات انہیں سے ہوئی۔ مزید یہ کہ ان کے نزدیک گدھے کا گوشت کھانا جائز ہے۔

مخالفت

علم کلام میں بشر کا مقام بہت بلند تھا، لیکن اپنے مذموم عقائد کی بنیاد پر ان کی خاطر خواہ عزت وتوقیر نہ ہو سکی بلکہ جب انہوں نے اپنے اختلافی عقائد کا اظہار کیا تو دیگر متکلمین کی طرح ان کی بھی مختلف شکلوں میں مخالفتیں شروع ہو گئیں۔ چنانچہ امام شافعیؒ جن کی صحبت میں یہ ایک مدت تک رہے انہوں نے بھی ان کی بحث سن کر یہ کہا کہ آخرت میں ان کی نجات مشکل ہے۔ اس کے علاوہ عقائد کے مسائل میں بشر سے ان کی مخالفت اتنی بڑھی کہ مناظرے تک کی نوبت آ گئی۔ وہ بہت زیادہ بدنام زمانہ بھی ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ابوالبختری نے امام شافعیؒ سے ان کے مذموم عقائد کی تفصیل سنی تو کہا کہ ایک مزید گواہ تیار کر لیجئے اور بشر کو قتل کرنے کا فتویٰ دے دیجئے۔

حضرت امام ابو یوسف جو ان کے اساتذہ میں تھے وہ بھی ان کو برا کہتے تھے۔ اور بہ طور ذم اکثر کہا کرتے تھے کہ میرے نزدیک بشر کپڑا سینے والی سوئی کے مانند

ہے جس کے کنارے تو بھاری ہیں لیکن اندرونی حصہ تنگ ہے۔

وفات

بشر کے سال وفات میں معمولی اختلاف ہے۔ابن خلکان، خطیب بغدادی، صاحب جواہر المضیہ نے ان کی وفات کا سنہ ۲۱۸ھ اور سنہ ۲۱۹ھ لکھا ہے، لیکن مسعودی اور جاحظ نے آخری قول یعنی ۲۱۹ھ کو سنہ وفات قرار دیا ہے اور راجح قول بھی یہی ہے۔ بشر کو بغداد میں سپرد خاک کیا گیا۔

تصنیفات

جواہر المضیہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ بشر صاحب تصنیف و تالیف بھی تھے لیکن کس فن اور کون سے موضوعات پر انہوں نے خامہ فرسائی کی تھی نیز کون کون سی کتابیں ان کی تصنیف کردہ ہیں یہ معمہ باوجود تلاش بسیار کے حل نہ ہو سکا۔ اس لئے صاحب جواہر المضیہ کے قول کو درست قرار دیا جائے یہ بات سمجھ سے باہر ہے۔ان کی تصنیف کردہ کتابیں کیا ہوئیں کہ تذکرہ نگاروں کو بھی ان کے اسماء کا پتہ نہ چل سکا۔

(ماخذ: وفیات الاعیان، جواہر المضیہ، الملل و النحل، تاریخ بغداد، مروج الذہب)

ابراہیم النظام

۱۸۵ھ------۲۲۱ھ

ابو اسحاق ابراہیم بن سیار بن ہانی النظام کی ولادت بصرہ میں ۱۸۵ھ میں ہوئی۔ وہیں ان کی نشوونما ہوئی، لیکن عمر کا آخری حصہ بغداد میں گزرا۔ یہ شعر و ادب کے بھی ماہر تھے۔ ان کی شہرت کا سبب ان کے مذہبی اجتہادات تھے جنہوں نے عہد عباسیہ کی تہذیب پر اچھا خاصہ اثر ڈالا تھا۔

نظام بچپن ہی سے بڑے ذہین اور سریع الفہم تھے۔ چنانچہ جب ابتدائی تعلیم کے لئے استاذ خلیل بن احمد کے پاس لائے گئے تو اپنی فطری قابلیت کا سکہ کچھ اس طرح ان پر بٹھایا کہ خلیل بن احمد نے ان کے آگے اپنی کم مائیگی اور کم علمی کا اعتراف کر لیا۔

یہ علم کلام میں شروع شروع ابو الہذیل العلاف کے شاگرد ہوئے لیکن بعض مسائل میں استاذ محترم سے اختلاف کی بناء پر اعتزال کی ایک نئی شاخ کی بنیاد پڑ گئی جسے فرقہ نظامیہ سے موسوم کیا گیا۔ اس طرح ان کا شمار ائمہ معتزلہ میں ہونے لگا۔

نظام لکھنا پڑھنا زیادہ نہیں جانتے تھے، البتہ ان کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ قرآن، انجیل اور توریت اور زبور مع تفاسیر دماغ میں محفوظ تھے۔ اس کے علاوہ شعراء عرب کے بے شمار اشعار اور قضاۃ حضرات کے فیصلے، فلسفہ و کلام کے اہم مسائل بھی از بر تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جعفری برمکی کی مجلس میں ارسطو کا تذکرہ ہوا تو نظام نے کہا کہ ''میں نے ارسطو کی کتاب پر تنقید کی ہے''۔ جعفر نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے ؟تم تو اسے اچھی طرح پڑھ بھی نہیں سکتے۔ نظام نے کہا ''آپ اسے شروع سے سننا چاہتے ہیں یا آخر سے'' اور پھر ارسطو کی کتاب از اول تا آخر سنا دی۔ اور ہر مسئلہ پر اعتراض کرتے

چلے گئے۔ چنانچہ جاحظ نے ان کی اسی خصوصیت اور اعلیٰ علمی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر یہ کہا ہے کہ "ہر ہزار سال بعد ایک باکمال انسان پیدا ہوتا ہے، اگر یہ قول درست ہے تو وہ باکمال انسان ابراہیم النظام ہیں"

علم ہندسہ میں انہوں نے ظفرہ کا مسئلہ ایجاد کیا۔ طبعیات میں سب سے پہلے انہوں نے ثابت کیا کہ رنگ، بو، ذائقہ، روشنی، حرارت وغیرہ اعراض مادی ہیں اور انہیں اعراض سے مادہ مرکب ہوتا ہے۔

عقائد

نظام کے خصوصی عقائد یہ ہیں: جزء لا یتجزیٰ کے وجود کا انکار۔ مسئلہ تناسخ کا اقرار۔ بدی اور گناہ خدا کی قدرت سے خارج ہیں۔ انسان نام ہے نفس ناطقہ کا اور جسم نفس ناطقہ کے صدور افعال کا آلہ ہے۔ قرآن کا معجزہ فصاحت و بلاغت نہیں ہے بلکہ غیب کی بات کی نشاندہی اور اس میں پیش گوئی کی گئی ہے۔ اجماع حجت شرعی نہیں ہے۔ احکام شرع کے وارد ہونے سے قبل دلائل عقلیہ سے خدا کی معرفت حاصل کرنی چاہئے۔ معجزہ شق القمر کے وقوع اور جنات کے وجود کا انکار۔

نظام کے شاگردوں میں جاحظ احمد بن حائط، ابوعفان نظامی اور زرقان خاص ہیں۔ نظام کی زندگی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہمیشہ فقر و فاقہ میں گزری۔ بلکہ اکثر تو یہ ہوا ہے کہ انہوں نے مٹی کھا کر اپنے پیٹ کی آگ بجھائی ہے۔ لیکن اس حال میں بھی انہوں نے کسی کا احسان لینا کبھی گوارہ نہیں کیا اور اسی عسرت و تنگ دستی کے عالم میں ۲۲۱ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

(ماخذ: دائرۃ المعارف، المنیۃ الامل، الفرق بین الفرق
کتاب الانساب سمعانی)

جعفر ابن مبشر معتزلی

متوفی ۲۳۴ھ

نام ونسب وسکونت

جعفر نام، ابو محمد کنیت۔ والد کا نام مبشر بن احمد بن محمد تھا۔ معتزلہ کے عقائد کی اتباع نے ان کو معتزلی کے نام سے مشہور کیا۔ ان کے بھائی جیش بن مبشر بغداد کے فقیہ تھے اور یہ خود بھی بغداد ہی میں رہتے تھے۔

تعلیم اور اساتذہ

جعفر نے عبدالعزیز بن آبان قرشی سے احادیث نقل کی ہیں۔ اور دیگر علوم کی تحصیل کے لئے کن کن اساتذہ کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے اس کا علم نہ ہو سکا۔

تلامذہ

جس طرح ان کے اساتذہ میں سے صرف ایک بزرگ عبدالعزیز آبان کا نام کتابوں میں ملتا ہے اسی طرح ان کے شاگردوں میں بھی صرف ایک شاگرد عبداللہ بن محمد یزیدی کا نام مورخوں نے لکھا ہے۔ عبداللہ نے جعفر سے حدیث کا درس لیا۔

عقائد

جعفر بن حرب جس کا تذکرہ آگے آیا ہی چاہتا ہے اور جعفر بن مبشر دونوں کے عقائد نے ایک نئے فرقے کو جنم دیا، جسے جعفریہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ جعفر بن مبشر اپنے عقائد کے ضمن میں یہ کہتے ہیں کہ امت مرحومہ کے فساق برائی میں یہودو

نصاریٰ اور مجوس وزنادقہ سے کسی طرح کم نہیں۔ چنانچہ اسی بناء پر فاسق موحد تو ہوگا مگر مومن یا کافر نہیں ہوسکتا۔ ساتھ ہی غلہ کا ایک دانا بھی چرانے والا ان کے نزدیک فاسق میں شمار ہوگا اور اس کے لئے خلود فی النار لازمی ہے۔ اس کے علاوہ ان کا قول یہ بھی ہے کہ گناہگاروں کو دوزخ میں ان کی سمجھ اور عقل کے اعتبار سے ڈالا جائے گا۔ جعفر بن مبشر کے نزدیک ایسے شخص پر حد زنا جاری نہیں ہوگی جو نکاح کی نیت سے کسی عورت سے وطی کرے۔

وفات

جعفر کی وفات ۲۳۴ھ میں ہوئی۔

تصنیفات

خطیب بغدادی نے علم کلام کے موضوع پر جعفر کی تصنیفات کا تذکرہ کیا ہے لیکن تصنیفات کے نام نہیں گنائے ہیں۔ اور نہ کسی دوسری کتاب میں اس کا تذکرہ مل سکا اور نہ خود ان کی تصنیف کردہ کوئی کتاب ہی مل سکی جس کے مطالعہ سے ان کے انداز بیان اور معیار وغیرہ کا علم ہوتا۔

(ماخذ : تاریخ بغداد، الفرق بین الفرق)

محمد بن ہذیل العلاف

۱۳۵ھ ------- ۲۳۵ ھ

نام ونسب وسکونت

محمد نام، ابو ہذیل کنیت۔ عرف عام میں علاف کہے جاتے تھے۔ عبداللہ بن مکحول کے پوتے تھے اور دادا کی جانب منسوب ہو کر عبدی کہے جاتے تھے۔ یہ نسبی طور پر موالی عبدالقیس میں سے تھے۔

پیدائش ووطن

محمد بن ہذیل کی ولادت بصرہ میں ۱۳۵ھ میں ہوئی۔

تعلیم اور اساتذہ

علاف نے اپنی عمر کا نصف سے زائد حصہ اپنے وطن بصرہ ہی میں گزارا اور ۲۰۳ھ میں بصرہ سے منتقل ہو کر بغداد چلے آئے۔ اس لئے ان کی علمی شخصیت اور ادبی ذوق بصرہ ہی کے اساتذہ علم وفن کا مرہون منت تھا۔ احادیث کی روایت انہوں نے غیاث بن ابراہیم اور سلیمان بن قرم سے کی ہے۔

علم وفضل

علاف کے علم وفضل اور ذہانت وفطانت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اپنی زندگی کی پندرہویں منزل میں قدم رکھتے ہی اختلافی مسائل پر مدلل ومکمل گفتگو کرنی شروع کر دی تھی۔ چنانچہ خطیب بغدادی نے اس دور کے ایک مناظرہ کا واقعہ بالتفصیل درج کیا ہے، جو ان کے اور ایک یہودی کے درمیان ہوا تھا۔ یہودی عالم تھا

جس نے بصرہ میں پہنچ کر تمام اجلہ متکلمین اور علماء مسلمین کو اپنے دلائل سے ساکت و صامت کر دیا تھا اور قریب تھا کہ فتنہ ارتداد کا پنجہ عامۃ المسلمین پر سخت ہو جاتا۔ اسی وقت علاف اپنے چچا کے ہمت دلانے پر مجلس مناظرہ میں پہنچے اور یہودی کے اعتراضوں کا جواب شافی دینے کے بعد خود علاف نے اس کے عقائد پر اعتراض کرنا شروع کر دیے۔ اس کے بعد تو وہ یہودی بغلیں جھانکنے لگا۔ اور وہ جس نے بڑے بڑے علماء کو پریشان کر دیا تھا علاف جیسے کم سن مناظر سے شکست کھا کر بصرہ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس طرح علاف نے ایک بہت بڑے فتنے کو سر اٹھانے سے قبل ہی کچل دیا۔

اس کے علاوہ بھی علاف نے بہت سے مناظروں میں حصہ لیا اور اپنے مضبوط دلائل کے ذریعہ مخالفین پر حاوی رہے۔ ایک بار ایک مجوسی سے مناظرہ شروع ہوا تو علاف کے رعب علم اور مضبوط دلیلوں کی وجہ سے اس کے قدم اکھڑ گئے۔ اور وہ مجوسی اپنے عقیدے سے تائب ہو کر مسلمان ہو گیا۔ اس مجوسی کا نام میلاس تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنی کتاب کا نام بھی اسی کے نام پر میلاس رکھا۔

ایک بار ماہیت، کیفیت اور تاثرات عشق کے موضوع پر مباحثہ ہوا۔ مباحثین کی تعداد تیرہ تھی اور سب ہی علم و فضل میں ایک دوسرے پر فوقیت رکھتے تھے۔ لیکن بعد مباحثہ جب نتیجہ کا اعلان ہوا تو محمد بن ہذیل العلاف تیسرے نمبر پر تھے۔ اس طرح یہ نہ صرف معتزلین کے امام تھے بلکہ علمی و ادبی اعتبار سے بھی ان کا مقام بہت بلند تھا۔

دربار خلافت

محمد بن ہذیل علاف کی رسائی نہ صرف یہ کہ روساء و امراء کے دربار تک تھی بلکہ دربار خلافت میں بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ جس وقت متکلمین و معتزلین مامون کے عتاب کا شکار ہو کر قتل کئے جا رہے تھے اس وقت علاف

امن وچین کی بانسری بجارہے تھے اور پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ایک مرتبہ تمام متکلمین کو مامون نے جمع کر کے سزادینی شروع کی لیکن جب علاف کو سزا دینے کی باری آئی تو مامون نے ان کی جانب سے چشم پوشی کرتے ہوئے کہا کہ اگر کوئی دوسرا جہنمی رہ گیا ہے تو اسے حاضر کرو۔اس کے علاوہ خلیفہ مامون کے بیت حکمت کے نگہبان سہل بن مارون بھی ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ایک مرتبہ انہوں نے علاف کے لئے ایک شخص سے سفارش بھی کی تھی تاکہ ان کی حاجت براری میں سہولت ہوجائے۔

یہ تمام حوالے اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ باوجود اختلاف عقائد کے علمی برتری کی بناء پر جس قدر و منزلت کے یہ مستحق تھے اس سے کسی نے بھی غفلت نہیں برتی خواہ وہ خلیفہ وقت ہو یا امراء و رؤساء کیوں نہ ہوں۔

وفات

محمد بن ہذیل علاف کی وفات میں مورخین کا اختلاف ہے۔ابن خلکان اور خطیب بغدادی نے ان کا سال وفات ۲۳۵ھ لکھا ہے۔اور دوسرے اقوال کے مقابلے میں اسے ترجیح دیتے ہوئے لکھا ہے کہ وفات کے وقت ان کی عمر سو سال تھی۔

تصنیفات

محمد بن ہذیل علاف کی تصنیفات میں سے صرف ایک کتاب میلاس کا تذکرہ کتابوں میں ملتا ہے، جس کی وجہ تسمیہ گزشتہ سطروں میں بیان کی گئی ہے۔

(ماخذ : وفیات الاعیان-تاریخ بغداد)

جعفر بن حرب

۱۷۷ھ ------- ۲۳۶ھ

نام وطن اور پیدائش

نام جعفر تھا۔ یہ حرب ہمدان کے بیٹے تھے۔ ان کے والد ابتدا میں ہمدان میں رہتے تھے، اسی وجہ سے خطیب بغدادی نے انہیں ہمدانی لکھا ہے۔ بعد میں یہ ہمدان سے منتقل ہوکر بغداد آگئے اور یہیں کے ہوکر رہ گئے۔

جعفر کی ولادت ۱۷۷ء کے قریب ہوئی لیکن اس کا تعین نہ ہوسکا کہ جعفر کے والد جس وقت ہمدان میں تھے اس وقت ان کی ولادت ہوئی یا بغداد میں ہوئی۔

تعلیم اور اساتذہ

جعفر کی ابتدائی تعلیم کا حال معلوم نہیں ہوسکا۔ لیکن علم کلام میں انہیں ابو ہذیل علاف اور عیسیٰ بن صبیح سے تلمذ تھا۔

دربار خلافت وقدرومنزلت

جعفر بن حرب معتزلین میں اکابرین کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور مشہور و معروف شخصیت کے حامل تھے۔ خلیفہ واثق باللہ کے دربار میں نہ صرف یہ کہ انہیں رسائی حاصل تھی بلکہ دیگر ندماء وہم مجلسوں کے مقابلہ میں خصوصی اور امتیازی شان رکھتے تھے۔

عقائد

جعفر بن حرب اپنے استاذ مردار کے پیرو تھے۔ بعض مسائل میں ان سے اختلاف بھی تھا۔ لیکن اختلافی مسائل کا تذکرہ تفصیلی طور پر تذکرہ نگاروں نے نہیں کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہو کہ ان کے مخصوص عقائد کیا تھے۔ ہاں چند مسائل ایسے ہیں جن کو علماء معتزلہ کے عقائد کے رد میں لکھا ہے جن میں بعض پر اجمالی نوٹ عبد القاہر

بغدادی نے اپنی کتاب ''الفرق بین الفرق'' میں لکھا ہے۔اسی سے ان کے عقائد کا کچھ صحیح طور پر اندازہ ہوتا ہے۔

جعفر بن حرب نے ایک کتاب ابن ہذیل علاف کے عقائد کے رد میں لکھی ہے، جس میں انہوں نے ابن ہذیل علاف کے اس قول کو غلط قرار دیا ہے کہ اللہ کی قدرت فنا ہو جائے گی اور اس کے بعد وہ کسی کام کے کرنے پر قادر نہ ہوگا۔اسی طرح جنت کی نعمتیں اور دوزخ کا عذاب فنا ہو جائے گا۔لیکن جنتی و دوزخی باقی رہے گیں۔اس وقت اللہ تعالیٰ ان کی موت پر قادر نہ ہوگا۔نہ تو وہ مردوں کو زندہ کر سکے گا اور نہ زندوں کو مار سکے گا۔نہ تو متحرک کو ساکن کر سکے گا اور نہ ساکن کو متحرک۔غرضیکہ وہ کسی کام کے کرنے پر قدرت نہیں رکھے گا۔چنانچہ ابن ہذیل کے انہیں عقائد کی جعفر بن حرب نے تردید کی اور اپنے عقائد وخیالات کو دلائل و براہین سے ثابت۔

اس کے علاوہ انہوں نے ایک کتاب نظام کے عقیدۂ جزء لایتجزی کے ابطال میں لکھی اور اس خیال کو ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جزء لایتجزی کوئی چیز نہیں ہے۔ایک بار ان سے اور جبائی سے اس مسئلہ پر مناظرہ بھی ہوا تھا کہ ''اللہ تعالیٰ پاگلوں اور انتہائی عاقلوں پر ظلم کرنے کی قدرت نہیں رکھتا''۔جبائی اس خیال کے حامی تھے جب کہ جعفر بن حرب اس خیال کی مخالفت میں دلائل و براہین کے ڈھیر لگا رہے تھے۔ بالآخر جبائی کو اپنی شکست تسلیم کرنی پڑی۔اس طرح مناظرہ اپنے اختتام کو پہنچا۔اس مناظرہ اور موضوع بحث سے ان کے عقیدہ پر روشنی پڑتی ہے۔

وفات جعفر بن حرب نے ۵۹ سال کی عمر میں ۲۳۶ھ میں انتقال کیا۔

تصنیفات

علم کلام میں یہ مشہور و معروف کتابوں کے مصنف قرار دئے گئے ہیں۔ لیکن ان میں صرف درج ذیل دو کتابوں کا تذکرہ عبدالقاہر بغدادی نے کیا ہے

توبیخ ابوالہذیل اور تکفیر النظام

(ماخذ : الفرق بین الفرق-تاریخ بغداد)

قاضی احمد بن ابوداؤدابادی

۱۶۰ھ ------- ۲۴۰ھ

نام ونسب

احمد نام۔ ابوعبداللہ کنیت۔ یہ ابوداؤد کے لڑکے اور جریر کے پوتے تھے۔ ان کے والد کے نام کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض انہیں ابوداؤد فرج (مع الجیم) لکھتے ہیں اور بعض فرح (مع الحاء) لکھتے ہیں۔ لیکن خود قاضی احمد سے جب مامون نے ان کے والد کے نام کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے ابوداؤد بتایا۔ اور بتایا کہ یہی نام بھی ہے اور کنیت بھی۔ اس لئے کسی دوسرے نام فرج یا فرح کا اختلاف قائم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ابن خلکان نے ان کا سلسلہ نسب اس طرح بیان کیا ہے۔

ابوعبداللہ احمد بن ابی داؤد فرج بن جریر بن مالک بن عبداللہ بن عباد بن سلام بن مالک بن عبد ہند بن لخم بن مالک بن قنص بن منعتہ بن برجان بن دوس بن الدیلیل بن امیہ بن حذافتہ بن زہر بن ایاد بن نزار بن معد بن عدنان- ایادی

ایادی لکھنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ایاد بن نزار ان کے اجداد میں سے ایک بزرگ تھے۔ انہی کی جانب اپنے آپ کو وہ منسوب کرتے تھے، جیسا کہ سلسلہ نسب سے واضح ہے۔

پیدائش ووطن

قاضی احمد کے آباواجداد قریہ قنسرین کے رہنے والے تھے لیکن ان کے

والد بغرض تجارت ملک شام اور شام سے پھر بصرہ میں آ کر مستقل قیام پذیر ہو گئے اور اپنے آبائی وطن کو خیر باد کہہ دیا۔ چنانچہ بصرہ میں قاضی احمد کی ولادت ۱۶۰ھ میں ہوئی۔

ابتدائی تعلیم اور اساتذہ

قاضی احمد کی ابتدائی تعلیم بصرہ ہی میں ہوئی۔ پھر جب بڑے ہوئے تو علم کلام اور فقہ کی جانب توجہ کی اور ھیاج بن علاء سلمی اور واصل بن عطاء کی مجلسوں میں حاضر ہونے لگے جس کا یہ اثر ہوا کہ یہ مذہب اعتزال کی جانب پوری طرح مائل ہو گئے

دربار خلافت میں رسائی اور قدر و منزلت

قاضی احمد خلیفہ مامون کے دربار میں پہلی مرتبہ جانے کا واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ اور چند دوسرے حضرات قاضی یحیٰی بن اکثم کے پاس بیٹھے تھے کہ خلیفہ کا قاصد پہنچا اور قاضی یحیٰی اکثم سے کہا کہ آپ کو خلیفہ نے ابھی طلب کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس وقت آپ کے پاس جتنے حضرات بیٹھے ہیں ان کو بھی اپنے ساتھ لیتے آئیں۔ تمام لوگوں کے ساتھ قاضی احمد بھی مامون کے سامنے تشریف لائے۔ مامون نے درمیان گفتگو قاضی احمد کی اعلیٰ علمی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے ان کے اسلاف کے بارے میں بھی کچھ معلومات حاصل کی اور برابر دربار خلافت میں آنے کی درخواست کی۔ لیکن ان تمام مقبولیتوں کے پس پردہ یحیٰی بن اکثم کی عنایتیں اور قدر دانیاں تھیں جو قاضی احمد کے شامل حال تھیں اور جنہوں نے قاضی احمد کو بام عروج پر پہنچنے اور خلیفہ وقت کے خصوصی مشیر بننے کے مواقع فراہم کیے۔ قاضی احمد کی قدر یحیٰی بن اکثم اس قدر کرتے تھے کہ جب وہ بصرہ اور خراسان کے قضاء کے عہدے پر فائز ہوئے تو انہوں نے قاضی احمد کو اپنی مجلس کا ایک رکن مقرر کیا۔ پھر جب مامون

نے ۲۰۴ھ میں تخت خلافت کو سنبھالا تو اس نے یحییٰ بن اکثم سے اہل علم کی ایک فہرست مانگی تا کہ فہرست میں شامل تمام علماء اس کے دربار میں حاضر رہا کریں اور اپنے مفید مشوروں سے اس کی رہنمائی کیا کریں۔ بیس اشخاص پر مشتمل اس فہرست میں قاضی احمد کا بھی نام نامی اسم گرامی تھا۔ پھر مامون نے ان میں سے دس ناموں کو منتخب کروایا اس میں بھی قاضی احمد کا نام تھا۔ پھر دس میں سے پانچ کو لیا گیا تو اس پانچ میں بھی قاضی احمد کا نام تھا۔ اس واقعہ سے قاضی احمد کے علوئے مرتبت، ذی علمی اور قدر و منزلت کا علم ہوتا ہے۔

مامون کے دل میں قاضی احمد کی اتنی قدر تھی کہ اپنی موت کے وقت بھی مامون نے ان کو فراموش نہیں کیا۔ بلکہ اپنے بھائی معتصم کو وصیت کی کہ وہ ہر کام میں قاضی احمد سے مشورہ لیا کرے۔ اس لیے کہ مشیر کی حیثیت سے کوئی دوسرا ان سے زیادہ صلاحیت کا مالک نہیں تھا۔ چنانچہ جب مسند خلافت پر معتصم جلوہ افروز ہوا تو اس نے قاضی احمد کی قدر و منزلت بھائی کی وصیت سے بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر کی۔ یعنی یحییٰ بن اکثم کو قاضی القضاۃ کے منصب سے معزول کر کے ان کی جگہ پر قاضی احمد کو بحال کیا اور کوئی کام قاضی احمد کے مشورہ کے بغیر نہیں کرتا، خواہ اس میں نقصان ہی کیوں نہ ہو۔

پھر معتصم کی وفات کے بعد جب واثق باللہ نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالی تو اس وقت بھی قاضی احمد کے اعزاز اور خصوصیات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہاں تک کہ متوکل بھی مسند آرائے سلطنت ہوا اور قاضی احمد بھی فالج جیسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو کر اپنی قوت و طاقت کھو بیٹھے۔

خلاصہ یہ کہ مامون کے عہد خلافت میں تو یہ مقربین اور مصاحبین میں تھے ہی لیکن جب معتصم اور پھر واثق کا دور آیا تو ان کے مراتب اور زیادہ بلند ہو گئے اور

انہیں کافی اختیارات بھی سونپے گئے۔ ان کے تعلقات بھی بہت وسیع ہو گئے۔ خلافت کے امور میں ہاتھ بٹانے کی بناء پر رعب و دبدبہ میں بھی اضافہ ہو گیا۔

عقائد

قاضی احمد عقیدتاً جہم بن صفوان کے پیرو تھے، جن کا قول یہ تھا کہ ''انسان مجبور محض ہے۔ بعض احکام ایسے ہیں جو اس سے اضطراری طور پر سرزد ہوتے ہیں ورنہ وہ حقیقت میں کسی کام کے کرنے پر قادر نہیں''۔ ان کے نزدیک ''جنت و جہنم دونوں ہی فنا ہو جانے والے ہیں''۔ ''ایمان محض اللہ کی معرفت اور کفر اللہ کے وجود سے لاعلمی یا جہالت کا نام ہے''۔ ان کا گمان یہ بھی تھا کہ اللہ کا علم اور کلام اللہ حادث ہے۔ اسی بناء پر انہوں نے قرآن کو مخلوق مانا ہے۔

مسئلہ خلق قرآن پر قاضی احمد کا اصرار

قاضی احمد کے عقائد صرف عوام الناس ہی تک محدود نہ رہے بلکہ ان کی شخصیت اور اثر و رسوخ کچھ ایسے تھے کہ خلیفہ وقت کے عقائد پر بھی اثر انداز ہوئے اور وہ فتنہ جو محض عوام الناس اور علماء تک محدود تھا دربار خلافت [illegible] میں ترقی کرنے لگا اور خلفاء حضرات نت نئے طریقے سے علماء حق کو اپنے خیالات کا پیرو بنانے کی کوشش کرنے لگے اور تشدد پر بھی اتر آئے۔ بظاہر یہ تمام کام تو خلیفہ وقت کے حکم سے ہوتا تھا لیکن اس میں درحقیقت قاضی احمد کا ہاتھ ہوتا اور وہی مذہب اعتزال کی اشاعت کے لئے خلفاء و امراء سے عمل درآمد کراتے۔

خطیب بغدادی نے تو صرف یہ لکھا ہے کہ قاضی احمد واثق باللہ پر پوری طرح حاوی تھے اور انہوں نے مسئلہ خلق قرآن کے سلسلہ میں علماء و فقہا پر بہت سختی

کرائی۔ جب کہ یہ درست نہیں تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قاضی احمد واثق باللہ پر ہی حاوی نہیں تھے بلکہ مامون اور معتصم پر بھی حاوی تھے، اس لئے کہ خلق قرآن کا مسئلہ اور اس سلسلہ کے امتحانات اور سختیاں مامون کے زمانے سے ہی شروع ہو چکی تھیں۔ اور مامون کے زمانے سے ہی اس عقیدہ کا اظہار نہایت پر زور انداز میں کیا گیا تھا۔ پھر معتصم نے بھی اس سلسلہ کو برقرار رکھا چنانچہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے ساتھ جو سختیاں کی گئیں ان کے پس پشت بھی قاضی احمد کا ہاتھ بتایا جاتا ہے اس لئے کہ ماہ رمضان ۲۲۰ھ میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا جو امتحان لیا گیا تھا تو اس کے ممتحن قاضی احمد اور ابن داؤد ایادی ہی تھے۔ جس کے بعد کلام اللہ کو مخلوق ماننے سے انکار کرنے پر روزہ کی حالت میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ پر کوڑے برسائے گئے۔ ایک عرصہ تک قید و بند کی زندگی گزارنے پر بھی مجبور کئے گئے اور طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں۔

محاسن

قاضی احمد اگر چہ انتہائی متشدد معتزلی تھے اور عقائد کے سلسلے میں خلفاء وقت نے اس قدر سختی انہی کے اشارے پر کی جس کی وجہ سے بے شمار ائمہ وقت اور علماء حق کو مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ لیکن ان تمام خامیوں کے باوجود کچھ ایسی خوبیاں بھی تھیں جن کا تذکرہ نہ کرنا حق و انصاف کا گلا گھونٹنے کے برابر ہوگا۔

جود و سخا

جود و سخا میں قاضی احمد اپنی مثال آپ تھے۔ اکثر مواقع پر انہوں نے

ضرورت مندوں کی بلا تامل و بلا جھجک امداد کی۔ چونکہ با اقتدار تھے اس لئے اکثر شعراء بھی قصائد پیش کرتے تھے اور ان سے فیض یاب ہوتے رہتے تھے۔ ان کی سخاوت کی کئی مثالیں بھی خطیب بغدادی نے درج کی ہیں جن میں دو ایک کا تذکرہ خارج از بحث نہ ہوگا۔

ایک مرتبہ مسیح ابن ابی حاتم قاضی احمد کے پاس شکستہ حالت میں تشریف لائے۔ قاضی احمد نے ان کی حالت دیکھ کر دریافت کیا کہ ''آخر تم نے مجھ سے اپنی ضرورتوں کو بیان کیوں نہیں کیا؟'' انہوں نے جواب دیا کہ ''اگر میں سوال کرتا تو یہی سوال آپ کے عطیات کی قیمت ہو جاتی اس لئے میں خاموش رہا۔'' قاضی احمد ان کی عجز و انکساری سے بہت خوش ہوئے اور اسی وقت انہوں نے مسیح ابن ابی حاتم کی پانچ ہزار دراہم سے امداد فرمائی۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک لوہار خلیفہ واثق باللہ کے دور خلافت میں انتہائی تنگ دستی کی زندگی گزار رہا تھا اور کسی وجہ سے وہ سرکاری مظالم کا شکار بھی ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے واقعات کو براہ راست خلیفہ کے روبرو پیش کیا۔ خلیفہ نے مظلوم کے ساتھ انصاف کرنے کا اختیار قاضی احمد کے حوالہ کر دیا۔ قاضی احمد جب تمام مظلوموں کے مقدمات سے فارغ ہو چکے تو آخر میں اس لوہار کو بلا کر دریافت کیا۔ ''کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟'' لوہار نے نفی میں جواب دیا۔ قاضی احمد نے اسے یاد دلایا کہ ایک مرتبہ میرے جوتے میں کچھ خرابی آ گئی تھی تو تم نے اسے درست کر دیا تھا۔ میں تمہیں آج اس کا بہترین بدلہ دوں گا تاکہ تمہاری تنگی اور مصیبت دور ہو جائے۔ اس کے بعد انہوں نے اسے پانچ سو دینار عطا کئے، جس کے نتیجہ میں پھر کبھی وہ شخص مفلس نہیں دیکھا گیا۔

علوئے ہمت

قاضی احمد کی عالی ہمتی کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے خلیفہ وقت کو اپنی دانست میں ہمہ وقت درست مشوروں سے نوازا اوراس کے برے نتائج کی فکرنہیں کی۔خلفائے وقت بھی جاہل اور کم ظرف نہ تھے، جو سچی بات اور نیک مشوروں پر انہیں زجر وتوبیخ کرتے اور سزا دیتے۔ بلکہ انہوں نے قاضی احمد کی اس خوبی کی قدر کی اور اس کی وجہ سے اعلیٰ سے اعلیٰ مناصب عطا کرتے گئے۔اکثر ایسا بھی ہوا کہ انہوں نے خلیفہ وقت کے احکام کی بھی پرواہ نہیں کی اور وہی کیا جس کی فی الواقع ضرورت تھی۔

چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ خلیفہ واثق باللہ نے دس ہزار دراہم بنو ہاشم کے دس افراد پر تقسیم کرنے کا کام انہیں سونپا تھا اور انہوں نے مزید دس ہزار دراہم بنو ہاشم پر خرچ کر دئے۔ جب حساب و کتاب کا وقت آیا تو خلیفہ نے سختی سے کہا کہ میں نے تو صرف دس ہزار دراہم بنو ہاشم پر خرچ کرنے کے لئے آپ کے حوالے کئے تھے۔ آپ نے مزید دس ہزار خرچ کرنے کی ہمت کیسے کی؟ خلیفہ کے اس سخت لہجے سے قاضی احمد پر کوئی اثر نہ پڑا اور انہوں نے نہایت پرسکون انداز میں جواب دیا کہ میرے خیال کے مطابق آپ کے لئے ثواب حاصل کرنے کا ایک اچھا موقع تھا میں اس سے چشم پوشی کیسے کرسکتا تھا؟ ذرا سی بخالت سے اتنے بڑے فائدے کو کیسے نظر انداز کر دیتا؟ قاضی احمد کے اس جواب سے خلیفہ وقت واثق باللہ اس قدر خوش ہوئے کہ مزید ایک لاکھ دراہم بنو ہاشم پر خرچ کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

علم وفضل

قاضی احمد کی علمی صلاحیت کا یہ عالم تھا کہ علم الکلام میں اکثر و بیشتر علماء و فقہا نے محض ان کے انداز بیان اور مضبوط دلائل کی بناء پر قرآن کو مخلوق مان لیا تھا اور

ان کے عقائد کے حامی ہو گئے تھے۔ بعض حضرات ایسے بھی تھے جنہیں ہلاکت وتباہی کے خوف نے بھی متزلزل کر دیا تھا۔ البتہ جتنا اثر رعب خلافت نے معتزلیوں کے عقائد کی اشاعت میں کیا تھا اس سے کہیں زیادہ قاضی احمد کے مضبوط دلائل و براہین اس سلسلہ میں کام کر رہے تھے۔ فصاحت وبلاغت میں بھی ایک زمانہ تک ان کا لوہا مانا جاتا تھا۔ انہیں شعر وشاعری سے بھی شغف تھا۔ شعراء کی سرپرستی سے یہ ادباء کی نظر میں اور بھی مقبول ہو گئے تھے۔ چنانچہ شاعر اعظم ابوتمام طائی اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کی مدح سرائی میں اشعار پیش کر کے اپنے کلام کی داد میں دراہم ودنانیر وصول کرتے۔

وفات

قاضی احمد خلیفہ متوکل علی اللہ کے دور خلافت میں فالج جیسے مہلک مرض میں مبتلا ہوئے اور چند دنوں کے بعد ماہ محرم الحرام ۲۴۰ھ مطابق ۸۵۴ء میں اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ اور بغداد میں اپنے مکان کے احاطہ میں مدفون ہوئے۔ ان کی نماز جنازہ ان کے صاحبزادے عباس نے پڑھائی۔

انتقال کی خبر سے اہل علم میں مایوسی

جب ان کا انتقال ہوا تو اس کی خبر پھیلتے ہی ایک بہت بڑی جماعت ان کے مکان کے دروازے پر جمع ہو گئی اور ان میں سے اکثر کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ ''منبع جود وکرم ومخزن علم وادب آج اٹھ گیا''۔ کوئی شخص انہیں برائی سے یاد نہیں کر رہا تھا۔ شعراء حضرات نے بھی ان کی مدح میں اشعار اور قصیدے پڑھے۔

(ماخذ: وفیات الاعیان جلد اول، تاریخ بغدادی، الفرق بین الفرق، البیان والتبیین)

احمد بن یحییٰ راوندی

۲۰۵ھ -------- ۲۴۵ ھ

نام ونسب

نام احمد، کنیت ابوالحسن، والد کا نام یحییٰ بن اسحاق تھا۔ آبائی مکان راوند تھا جو اصبہان کے علاقہ میں واقع ہے۔ اسی مناسبت سے انہیں راوندی کہا جاتا ہے۔ ان کا سنہ پیدائش یقین سے نہیں کہا جاسکتا ہے کہ یہ ہے۔

ابن خلکان کے بیان کے مطابق یہ اگرچہ مشہور ومعروف عالم دین اور ماہر علم کلام گزرے ہیں لیکن ان کی مکمل سوانح حیات اور سیرت دوسری کتابوں میں نہیں ملتی۔ ابن خلکان نے بھی ان کا مختصر تذکرہ کیا ہے جس سے ان کی زندگی کے کسی پہلو پر کوئی خاص روشنی نہیں پڑتی ہے۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم کلام میں ماہر تھے اور متکلمین کی ایک جماعت سے انہوں مناظرے بھی کئے تھے۔ ان کی تاریخ وفات بھی صحیح طور پر معلوم نہیں۔ غالباً ۲۴۵ یا ۲۵۰ ہے۔ وفات مقام رحبۃ یا بغداد میں ہوئی۔ علی اختلاف الاقوال عمر چالیس سال کی پائی۔

راوندی کی تصنیفات کی تعداد ایک سو چودہ بیان کی جاتی ہے۔ لیکن ابن خلکان نے صرف مندرجہ ذیل کتابوں کا تذکرہ کیا ہے:

کتاب فضیحت المعتزلہ، کتاب التاج، کتاب الزمرد۔ کتاب القصب۔

(ماخذ: وفیات الاعیان)

عمرو بن بحر الجاحظ

۱۶۰ھ -------- ۲۵۵ ھ

نام ونسب

عمرو نام اور ابو عثمان کنیت تھی لیکن جاحظ کے نام سے مشہور ہوئے اس لئے کہ جاحظ کے معنی بڑی آنکھ والا ہے۔اور عمرو کی آنکھیں کافی بڑی تھیں۔ان کے والد کا نام بحر اور دادا کا محبوب تھا لیکن محبوب کا چہرہ اتنا سیاہ تھا کہ عام طور پر انہیں فزارہ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔

جاحظ کی اصل کے متعلق مورخین کے اقوال مختلف ہیں۔بعضوں نے کہا ہے کہ یہ عربی الاصل تھے جبکہ بعض لوگوں نے انہیں افریقی بتایا ہے اور کہا کہ بعد میں عربوں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے عربی الاصل شمار کیے گئے۔اسی طرح ان کے کنانی ہونے کے سلسلہ میں اختلاف ہے۔ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ یہ نسباً کنانی تھے۔جبکہ دوسری جماعت کا قول یہ ہے کہ یہ بنی کنان کے غلاموں میں تھے۔لیکن اکثر مورخین مثلاً ابن الغباری، ابن عساکر اور یاقوت حموی وغیرہ کے نزدیک جاحظ نسباً کنانی اور لیثی تھے۔ان لوگوں کے قول کے مطابق ان کا سلسلہ نسب اس طرح ہے "لیث بن بکر بن عبد مناۃ بن کنانہ بن خزیمۃ"

جاحظ کو ابو قلمس عمرو بن قلع الکنانی کے موالی میں بھی شمار کیا گیا ہے اس لئے کہ ان کے دادا عمرو بن قلع الکنانی کے اونٹوں کی رکھوالی کیا کرتے تھے۔اس طرح یہ نسباً اور موالی دونوں ہی اعتبار سے کنانی ہوئے۔

پیدائش اور وطن

جاحظ کی ولادت بصرہ میں ۱۶۰ھ اور حنا فاخوری کے قول کے مطابق ۱۵۹ھ مطابق ۷۷۵ء میں ہوئی۔ ان کا آبائی وطن بھی بصرہ ہی تھا۔ خود تحصیل علم کی خاطر بصرہ سے منتقل ہو کر بغداد آئے اور بغداد ہی کے ہو کر رہ گئے۔

ابتدائی تعلیم اور اساتذہ

جاحظ کی ابتدائی تعلیم بصرہ ہی میں ہوئی۔ ابتدا میں یہ قصابوں کے لڑکوں کے ساتھ پڑھتے تھے اسی درمیان ان کے والد کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا۔ ان کا کوئی سرپرست اور کفیل نہ رہا اس لئے اپنی کفالت اور اخراجات کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے بصرہ کے بازار میں روٹی اور مچھلی پکا کر فروخت کرنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی اپنی تعلیم بھی جاری رکھی۔ تمام مصائب و آلام کا نہایت جواں مردی سے مقابلہ کرتے ہوئے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ کبھی اپنے اخراجات کے لئے کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔

بغداد کے بعد بصرہ ہی ایک اعلیٰ علمی مرکز تھا جہاں علماء کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ یہ لوگ بصرہ کی مسجد میں درس دیا کرتے تھے۔ جاحظ بھی ان کے حلقہ درس میں شامل ہو کر اپنی علمی صلاحیت کو بڑھاتے رہے، یہاں تک کہ ان کے بصرہ میں قیام ہی کے وقت ان کی علمی وادبی اور لسانی برتری کا ڈنکا بجنے لگا۔ عکاظ کی طرح فصحاء بصرہ بھی ہر سال مربد میں جمع ہوتے جس میں جاحظ بھی ایک خطیب کی حیثیت سے شامل ہونے لگے۔ اس طرح جاحظ نے بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی۔ پھر جب ان کا شعور مزید پختہ ہوا تو انہوں نے مزید حصول علم کی خاطر بغداد کا قصد کیا اور وہاں پہنچ کر علماء

ادب ونحو وائمہ حدیث وعلم کلام سے افادہ واستفادہ کا سلسلہ شروع کیا۔

جاحظ کے شیوخ حدیث میں ابوعبیدہ، اصمعی اور ابو زید انصاری بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ علم نحو کی تکمیل ابوالحسن اخفش سے کی اور علم کلام میں ابو اسحاق النظام کی شاگردی حاصل کی۔

جاحظ علماء ادب کی صف میں

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ جاحظ کی ذات سے جہاں علم کلام کی ترقی ہوئی وہیں وہ علم ادب، سوانح وتذکرہ اور لغت وحکمت کو بھی بام عروج پر پہنچانے سے پیچھے نہیں رہے۔ جاحظ نے اپنی صلاحیت کے مطابق ان علوم وفنون کی کافی اشاعت کی۔ انہوں نے عربی ادب میں جس نہج کی بنیاد رکھی اس پر بعد کے ادباء نے ایک مکمل عمارت کھڑی کی۔ اس لئے اگر انہیں امام علم وادب، نحو ونثر نگاری اور مقتداء علم لغت وحکمت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

ابتدا میں یہ اپنی تالیفات وتصنیفات کو ابن مقفع اور سہل بن ہارون کی جانب منسوب کرتے تھے اور اپنے نام کو ظاہر نہیں کرتے تھے۔ لیکن ''مشک بھی کہیں چھپائے چھپتا ہے'' اسی طرح جب ان کی تصنیفات کو مقبولیت عام حاصل ہوئی تو انکا نام بھی خود بخود منظر عام پر آنے لگا۔ جہاں ایک جماعت نے ان کی علمی وادبی صلاحیت پر خوشی ومسرت کا اظہار کیا وہیں ایک دوسری جماعت ان کی شہرت کو دیکھ کر حسد کرنے لگی۔

دربار خلافت میں رسائی

اکثر اہل علم کو دربار خلافت میں پہنچنے کے لئے کسی نہ کسی سہارے یا

سفارش کی ضرورت پڑتی ہے اور باوجود تبحر علمی اور شان امتیازی کے اس کوچہ میں بے یارومددگار ثابت ہوئے ہیں لیکن جاحظ کی سوانح حیات پر نظر ڈالی جائے تو واقعات اس کے برعکس نظر آتے ہیں۔ جاحظ کو دربار خلافت میں پہنچنے کے لئے نہ کسی سہارے کی ضرورت پڑی نہ سفارش کی۔ بلکہ خود ان کی شہرت اور تصنیف نے انہیں خلیفہ کے دربار میں پیش کر دیا۔ واقعہ یوں ہے کہ خلیفہ مامون الرشید نے ان کی تصنیف کردہ کتاب ''کتاب الامامۃ'' کا مطالعہ کیا تو اتنا زیادہ متاثر ہوا کہ اس نے انہیں بلا کر دولت عباسیہ اور اس کے استحقاق خلافت کے متعلق ایک رسالہ لکھنے کی فرمائش کی۔ جاحظ نے اس کی فرمائش پوری کر دی تو اس نے اس کے صلہ میں انہیں دیوان رسائل کا سربراہ مقرر کر دیا۔ لیکن جاحظ کو یہ منصب پسند نہیں آیا، جس کی وجہ کر صرف تین ہی دنوں کے بعد اس عہدہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ غور سے دیکھا جائے تو ان کا یہ فیصلہ درست تھا۔ اس لئے کہ اگر وہ رسائل کی ترتیب وانتظام میں مصروف رہتے تو پھر جو شہرت ان کے حصہ میں ایک ادیب اور متکلم کی حیثیت سے آئی وہ تا قیامت ان کی تلاش میں بھٹکتی رہتی۔ خود سہل بن ہارون کا قول ہے کہ اگر جاحظ اس منصب پر برقرار رہتے تو صاحب تصنیف کی حیثیت سے ان کا ستارہ غروب ہو جاتا۔

امراء وقت کی قدردانی اور حوصلہ افزائی

جاحظ نے خلیفہ مامون کے دیوان رسائل سے علاحدگی اختیار کرنے کے بعد چند سال تو نہایت آزادی سے زندگی بسر کی اور ہر غم وفکر سے آزاد رہ کر تصنیف و تالیف کے کام میں لگ گئے۔ معتصم اور اس کے بعد واثق باللہ کے وزیر محمد بن عبد الملک زیات کی صحبت اختیار کی اور اس کی مدح کے ساتھ ساتھ **کتاب الحیوان** لکھ کر اس کی خدمت میں پیش کی جس کے عوض انہیں پانچ ہزار دینار ملے۔ اسی زمانہ میں

انہوں نے دمشق، انطاکیہ اور مصر کا سفر بھی سیر و سیاحت کی غرض سے کیا اور اپنے تجربات میں اضافہ کر کے اپنی اس سیاحت کا اثر اپنی تصنیفات پر بھی چھوڑا۔ پھر واثق باللہ کی وفات کے بعد متوکل علی اللہ کی خلافت میں جب قاضی احمد بن داؤد کا ستارہ عروج پر تھا تو ابن زیات کے برے دن شروع ہو گئے۔ عقائد کے اختلاف کی بناء پر قاضی احمد کی ایماء پر ابن زیات قید کر لئے گئے۔ جاحظ چونکہ ابن زیات کے ہم نشینوں میں تھے بھاگ کھڑے ہوئے۔ قضاء کار کسی طرح گرفتار کر کے جاحظ کو قاضی احمد بن ابوداؤد کے حضور پیش کر دیا گیا۔ قاضی احمد ان پر سختی کرنے والے ہی تھے کہ انہوں نے چند ایسے ظریفانہ جملے کہے کہ قاضی احمد اور اس وقت کے حاضرین بے ساختہ ہنس پڑے اور یہی واقعہ ان کی رہائی اور قدر و منزلت کا ذریعہ بنا۔ یہاں تک کہ قاضی احمد سے انہیں اس درجہ قربت و محبت ہو گئی کہ انہوں نے البیان والتبیین جیسی مشہور و مستند کتاب لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کی جس کے صلہ میں قاضی احمد نے انہیں پانچ ہزار دینار عطاء کئے۔ قاضی احمد کی وفات کے بعد جب ان کے صاحبزادے ابوالولید مسند قضاء پر متمکن ہوئے تو جاحظ کا ان کے ساتھ رہنا شروع ہو گیا۔ خلیفہ متوکل کے وزیر فتح ابن خاقان سے بھی جاحظ کے تعلقات اچھے تھے۔ چنانچہ اکثر کتابیں انہوں نے فتح ابن خاقان کی خدمت میں بھی پیش کی ہیں اور عطایا سے نواز گئے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان بعض مواقع پر خط و کتابت کا بھی سلسلہ رہا ہے۔ نیز فتح ابن خاقان کی کوششوں سے خلیفہ متوکل کے دربار سے بھی اکثر دراہم و دنانیر کی شکل میں ان کی حوصلہ افزائی ہوتی رہتی تھی۔

عقائد

جاحظ کا شمار ائمہ متکلمین اور معتزلین میں ہوتا ہے۔ یہ علم کلام اور فلسفہ میں

اپنے زمانہ میں منفرد تھے۔ انہوں نے فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا جس کا اثر ان کے عقائد پر بھی پڑا اور یہ عقیدتاً مذہب اعتزال کی جانب مائل ہو گئے۔ لیکن فلسفہ میں مہارت رکھنے کی وجہ سے عام معتزلین کے عقائد کے تابع نہیں رہے بلکہ ان کے بعض اصول کی سختی سے مخالفت کی اور نئے عقائد کا اظہار کیا۔ اور فلسفیانہ دلائل سے انہیں ثابت کرنے کی بھرپور کوشش بھی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا ایک گروہ ان کے عقائد کا تابع ہو گیا اور ان اصولوں کو صحیح و درست تسلیم کرنے لگا، جسے ''فرقہ جاحظیہ'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس جماعت میں شامل لوگوں میں کعبی، ابن الراوندی اور ابو بکر الاصم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اجمالی طور پر جاحظ کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنے افعال کا کاسب نہیں اور نہ اس کو اپنے افعال پر کچھ اختیار ہے، بلکہ عادتاً تمام حرکات و سکنات عالم ظہور میں آتے رہتے ہیں۔ انسان صرف ارادہ کرتا ہے اور سارے افعال خود بخود صادر ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ان کا خیال یہ ہے کہ کسی شخص پر دوزخ کا عذاب ہمیشہ کے لئے نہیں ہو گا بلکہ آگ اپنی فطرت کے مطابق جو چیز اس کے حوالہ کی جائے گی اسے جذب کر لے گی اس لئے خلود فی النار بے معنی ہو جاتا ہے۔

جاحظ صفات باری کی نفی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ کو اختیار تو ہے لیکن اس کو قدرت نہیں کہ وہ غلطی کا یا جہالت کے افعال کا ارتکاب کرے، یا کسی پر قہر و غضب نازل کرے۔ ان کا قول یہ ہے کہ ساری دنیا اتنی عقل رکھتی ہے کہ وہ یہ سمجھ سکے کہ اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ ہمیں نبی کا محتاج بنایا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے اس کو پہچانیں۔ اسی طرح انسان میں دو متضاد صفتیں ایک وقت میں جمع ہو جاتی ہیں ایک تو یہ کہ توحید کی واقفیت رکھنا دوسرے یہ کہ کسی ذریعہ کے

نہ ہونے کی بناء پر اس واقفیت سے معذور رہنا۔

مزید یہ بھی کہتے ہیں کہ جو شخص اسلام میں داخل ہو اور یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ کا کوئی جسم یا اس کی صورت نہیں ہے یا وہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتا ہے تو وہ عدل کرتا ہے گناہگار نہیں ہوگا۔ بلکہ ان عقائد کے اقرار کے بعد ہی وہ سچا مومن ہوسکتا ہے اور اگر ان کا انکار صراحتاً یا اشارتاً بھی کرتا ہے تو وہ مشرک ہوگا۔ یا اگر ان عقائد کے متعلق کچھ بھی علم نہیں رکھتا ہے اور صرف اس کا اقرار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رب ہے اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں تب بھی وہ مومن ہوگا۔

اس فرقہ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ قرآن جسد حیوانی رکھتا ہے اور جسد کے لئے انقلاب جائز ہے۔ اگر ایک مرتبہ وہ انسان کی شکل میں ہوگا تو دوسری دفعہ حیوان کی صورت میں جیسا کہ ذیل کی عبارت سے ظاہر ہے۔

وحکی ان القرآن جسد یجوزان یقلب مرة رجلا و مرة حیوانا (اور منقول ہے کہ قرآن جسد رکھتا ہے تو اس کے لئے جائز ہے کہ ایک مرتبہ انسان بنے تو دوسری دفعہ حیوان ہو جائے)

اس عقیدہ سے ایک دوسرا عقیدہ تناسخ کا بھی اظہار ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرقہ جاحظیہ کے نزدیک تناسخ جائز ہے۔ مزید یہ ہے کہ جاحظیہ کے نزدیک عصمت انبیاء عقیدہ لغو ہے۔

مرض الموت اور وفات

آخر عمر میں جاحظ کے جسمانی قویٰ نے جواب دے دیا تھا اور مرض فالج میں مبتلا ہونے کے بعد اپنے وطن بصرہ لوٹ گئے اور اپنی وفات تک وہیں مقیم رہے۔

مبرد نے بیان کیا ہے کہ وہ جاحظ کے آخر دنوں میں ان کے پاس گئے اور

ان کا حال دریافت کیا تو جاحظ نے کہا" میرا حال کیا پوچھتے ہو نصف حصہ تو بالکل مفلوج ہو چکا ہے جس میں ذرا بھی حس نہیں اور نصف حصہ نقرس کی وجہ سے اتنا زیادہ حساس ہو گیا ہے کہ ذرا حرکت بھی تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔ غرضیکہ اسی حال میں ماہ محرم الحرام ۲۵۵ھ مطابق ۸۶۸ء میں بصرہ میں علم وادب کا یہ ستارہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۹۶ سال تھی۔

علمی ودینی مرتبہ

جاحظ کا شمار اکابر علماء میں ہوتا ہے۔ فلسفہ، علم کلام، علم حدیث اور شعر و ادب کے علاوہ ان کا مطالعہ ایک طرف علم ہندسہ، نجوم، ریاضی اور دوسری طرف فقہ اور تاریخ پر بھی محیط تھا۔ انہوں نے تراجم کی مدد سے یونانیوں کے علم کا بھی مطالعہ کیا کیوں کہ مورخوں نے لکھا ہے جاحظ فارسی زبان سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ چنانچہ یہی زبان علوم ہند وایران سے واقفیت اور ان کی ثقافت کا اثر قبول کرنے کا ذریعہ بنی۔

جاحظ بہ ظاہر بدصورت اور بدشکل تھے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مختلف خوبیوں میں وہ اپنے عہد میں بے مثال تھے۔ ان کا اخلاق بہت ہی وسیع تھا۔ یہاں تک کہ یہ اپنی برائی چاہنے والوں کے ساتھ بھی کبھی برائی سے پیش نہیں آئے۔ ان کی گفتگو میں زبردست حلاوت ومٹھاس تھی۔ یہ حاضر جواب بھی تھے۔ مورخوں نے لکھا ہے کہ عملی اعتبار سے یہ مومن تھے اور اپنے عقائد پر اٹل تھے۔ ابن فقیہ کا قول ہے کہ جاحظ آخری متکلم تھے جو اپنے دلائل کی کاٹ نہیں رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ دلائل کی بناء پر چھوٹے کو بڑا اور بڑے کو چھوٹا کر دکھانا ان کے لئے معمولی سا کھیل تھا۔

تصنیفات

جاحظ نے اپنی ساری زندگی تصنیف و تالیف میں گزاری۔ ان کی تصنیفات کی تعداد اندازاً تین سو پچاس بتائی جاتی ہے۔ان میں سے اکثر کتابیں مشہد ابو حنفیہ (بغداد) میں دیکھی گئی ہیں۔البتہ زیادہ تر کتابیں منظر عام پر آنے سے قبل ضائع ہو گئیں۔اس وقت چند کتابیں اور رسائل دستیاب ہو سکے ہیں۔کچھ کتابوں کا تذکرہ مختلف کتابوں میں ضمناً آیا ہے، جس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تصنیفات مختلف موضوعات پر علیٰحدہ علیٰحدہ فنوں پر مشتمل تھیں یاقوت نے بھی ان کی تصنیفات کی ایک طویل فہرست درج کی ہے جس کا یہاں درج کرنا موضوع سے خارج نہیں ہوگا:

۱ کتاب البیان والتبیین ۳ جلدیں
۲ کتاب النبی و المتنبی
۳ کتاب المعرفہ
۴ کتاب جوابات کتاب المعرفہ
۵ کتاب مسائل فی کتاب المعرفہ
۶ کتاب الرد علی اصحاب الالہام
۷ کتاب نظم القرآن
۸ کتاب مسائل القرآن
۹ کتاب فضیلۃ المعتزلہ
۱۰ کتاب الرد علی المشبہ
۱۱ کتاب الامامۃ علی مذہب الشیعہ
۱۲ کتاب حکایۃ قول اصناف الزیدیہ
۱۳ کتاب العثمانیۃ
۱۴ کتاب الاخبار وکیف تصح
۱۵ کتاب الرد علی النصاری
۱۶ کتاب عصام المرید
۱۷ کتاب الرد علی العثمانیۃ
۱۸ کتاب الامامۃ معاویۃ
۱۹ کتاب امامۃ بنی عباس
۲۰ کتاب الفتیان
۲۱ کتاب الفواد
۲۲ کتاب اللصوص

۲۳ کتاب ذکر ما بین الزیدیہ والرافضیہ

۲۴ کتاب ضیاعۃ الکلام

۲۵ کتاب المخاطبات فی التوحید

۲۶ کتاب تصویب علی فی تحکمین الحکمین

۲۷ کتاب وجوب الامامۃ

۲۸ کتاب الاصنام

۲۹ کتاب الوکلاء والموکلین

۳۰ کتاب الشارب والمشروب

۳۱ کتاب افتخار الشتاء والصیف

۳۲ کتاب المعلمین

۳۳ کتاب الحواری

۳۴ کتاب نوادر الحسن

۳۵ کتاب البخلاء الامامۃ فرص

۳۶ کتاب الفخر ما بین عبد شمس ومخزوم

۳۷ کتاب العرجان والبرصان

۳۸ کتاب فخر القحطانیۃ والعدنانیۃ

۳۹ کتاب التربیع والتدبیر

۴۰ کتاب الطفلین

۴۱ کتاب اخلاق الملوک

۴۲ کتاب الفتیا

۴۳ کتاب مناقب جند الخلافۃ وفضائل الاتراک

۴۴ کتاب الحاسد والمحسود

۴۵ کتاب الرد علی الیہود

۴۶ کتاب الصرحاء والھجناء

۴۷ کتاب السودان والبیضان

۴۸ کتاب المعاد والمعاش

۴۹ کتاب النساء

۵۰ کتاب التسویۃ بین العرب والعجم

۵۱ کتاب السلطان واخلاق اہلہ

۵۲ کتاب الوعید

۵۳ کتاب البلدان

۵۴ کتاب الاخبار

۵۵ کتاب الدلالۃ علی ان الامامۃ فرض

۵۶ کتاب الاستطاعۃ وخلق الافعال

۵۷ کتاب المقنین والغناء والصنعۃ

۵۸ کتاب الہدایا والمنحول

۵۹ کتاب الاخوان

۶۰ کتاب الرد علی من الحد فی کتاب اللہ

۶۱ کتاب آیۃ القرآن

۶۲ کتاب الناشی والمتلاشی

۶۳ کتاب الحانوط عطار

۶۴ کتاب التمثیل

۶۵ کتاب فضل العلم

۶۶ کتاب المزاح والجد

۶۷ کتاب جمہرۃ الملوک

۶۸ کتاب الصوالحۃ

۶۹ کتاب ذم الزناء

۷۰ کتاب التفکر والاعتبار

۷۱ کتاب الحجر والنبوۃ

۷۲ کتاب آل ابراہیم المدبر فی المکاتبۃ

۷۳ کتاب احالۃ القدرۃ علی الظلم

۷۴ کتاب امہات الاولاد

۷۵ کتاب الاعتزال وفضیلۃ عن المفضیلۃ

۷۶ کتاب الاخطار والمراتب والصناعات

۷۷ کتاب احدوثۃ العالم

۷۸ کتاب الرد علی ان الانسان جزء لا تجزی

۷۹ کتاب ابی النجم وجوابہ

۸۰ کتاب التفاح

۸۱ کتاب الانس والسلوۃ

۸۲ کتاب الکبر والمستحسن

۸۳ کتاب نقص الطب

۸۴ کتاب الحزم والجزم

۸۵ کتاب عناصر الآداب

۸۶ کتاب تحصین الاموال

۸۷ کتاب الامثال

۸۸ کتاب رسالۃ النجم فی الخراج

۸۹ کتاب فضل الفرس

۹۰ کتاب علی الہملاج

۹۱ کتاب الرسا سلہ الی ابی الفرح
بن نجاح فی افتحان عقول الاولیاء

۹۲ کتاب الرسالۃ فی القلم

۹۳ کتاب رسالۃ فی فضل اتخاذ الکتب

۹۴ کتاب رسالۃ فی کتمان السر

۹۵ کتاب رسالۃ فی مدح النبیذ

۹۶ کتاب رسالۃ فی ذم النبیذ

۹۷ کتاب رسالۃ فی العفو والصفح

۹۸ کتاب رسالۃ فی مدح الکتاب

۹۹ کتاب رسالۃ فی مدح الوراق

۱۰۰ کتاب رسالۃ فی ذم الکتاب

١٠١ کتاب رسالۃ اثم السکر
١٠٢ کتاب رسالۃ فی ذم الوراق
١٠٣ کتاب رسالة فیمن یسمی من الشعراء عمرا
١٠٤ کتاب رسالۃ یتیمۃ
١٠٥ کتاب رسالۃ فی فرط جھل یعقوب بن اسحاق الکندی
١٠٦ کتاب رسالۃ فی الکرم الی ابی الفرج بن نجاح
١٠٧ کتاب رسالۃ فی موت ابی حرب الصفار البصری
١٠٨ کتاب رسالۃ فی المیراث
١٠٩ کتاب فی الاسد والذئب
١١٠ کتاب رسالۃ فی الکتاب الکیمیا
١١١ کتاب الاستبداد والمشاورۃ فی الحرب
١١٢ کتاب رسالۃ فی القضاء والولاء
١١٣ کتاب الملوک والامم السالفہ والباقیہ
١١٤ کتاب رسالۃ فی الرد علی القولیۃ
١١٥ کتاب العالم والجاہل
١١٦ کتاب النرد والشطرنج
١١٧ کتاب غش الصناعات
١١٨ کتاب خصومۃ الحول والعور
١١٩ کتاب ذوی العاہات
١٢٠ کتاب المغنین
١٢١ کتاب اخلاق الشطار
١٢٢ کتاب الحیوان (٢ جلدوں میں)
١٢٣ کتاب خلق القرآن

درج بالا فہرست میں سے جتنی کتابیں راقم الحروف کو دستیاب ہوسکیں ان کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

البیان والتبیین

اس کی پہلی طباعت مصر جیسے علمی وادبی ملک سے ہوئی۔ پھر حسن السندوبی کی تصحیح اور تحشیہ کے بعد دوبارہ مصر ہی سے ١١٤٧-١٩٢٦ء میں تین جلدوں پر مشتمل اس کی

طباعت دوسری بار ہوئی۔ اس کی تیسری اور چوتھی مرتبہ بھی طباعت مصر ہی سے ۱۹۳۲ء اور ۱۹۴۷ء میں ہوئی۔ سنہ موخر الذکر والی طباعت کا ایک مکمل نسخہ میرے سامنے ہے۔

یہ ادب کی ایک ایسی کتاب ہے جسے جاحظ نے اپنی زندگی کے آخری دور میں تالیف کیا تھا۔ اس میں آیت قرآنی، احادیث نبوی، خطبات، اشعار اور فلسفہ و حکمت کا بہت اچھا انتخاب و امتزاج ملتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس میں مختلف مسائل کے بارے میں جاحظ نے اپنے خیالات بھی اچھے انداز میں ظاہر کیے ہیں۔ جاحظ کی دوسری کتابوں کی طرح اس میں بھی بلاغت، ادب اور تاریخی نکات بھرے پڑے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے ہمیں اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ عربی ثقافت میں کس طرح دوسری ثقافتیں مثلاً ایرانی، یونانی اور ہندوستانی ثقافت وتہذیب آکر ملتی گئی۔ اگر چہ اس کتاب میں تمام ثقافتیں کسی نہ کسی درجہ میں آئی ہیں لیکن غلبہ عربی ثقافت ہی کا ہے۔ اس کتاب کی ادبی اہمیت کے ثبوت میں ابن خلدون اور دیگر مشاہیر کا یہ قول خاصی شہرت و اہمیت رکھتا ہے کہ ''عربی اصل و اساس کی چار کتابیں ہیں: ابن قتیبہ کی 'ادب الکاتب'، مبرد کی 'الکامل'، جاحظ کی 'البیان والتبیین' اور ابوعلی قاری کی 'کتاب النوادر'۔ ان کے علاوہ اور جو کچھ ہے وہ ان ہی کی شاخ ہے اور ان کی نقل''

کتاب الحیوان

یہ کتاب سات اجزاء اور دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اجزاء کے بجائے کتاب میں مصحف لکھا گیا ہے۔ اس کی اشاعت کئی مرتبہ مصر ہی سے ہو چکی ہے۔ اس کی پہلی طباعت ۱۳۲۳ھ میں ہوئی۔ اس کے بعد ۱۳۲۶ھ میں ہوئی۔ پھر سہ بارہ عبد السلام محمد ہارون کی تحقیق و شرح کے ساتھ ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔ اس وقت میرے سامنے ۱۳۲۳ھ والی طباعت کا نسخہ ہے۔

یہ کتاب حیوان کی طبائع اور کیفیات کے بیان پر مشتمل ہے اور ساتھ ہی ساتھ فلسفہ وادب اور ظرافت کا بھی ذخیرہ ہے۔ علم وادب کی مختلف کتابوں میں جو کچھ

بکھرا ہوا تھا وہ اس میں یکجا ملتا ہے۔ عام انسانوں کی زبان پر جو اشعار، اقوال، قصص اور حکمت کی باتیں وقتاً فوقتاً آتی رہتی تھیں وہ بھی اس میں محفوظ کر لی گئی ہیں۔

مزید برآں انسانوں اور جانوروں کے باہمی تعلقات و معاملات کی بھی ایک دلچسپ روداد ہے۔ جاحظ نے خود لکھا ہے کہ "یہ کتاب انہوں نے اس لئے تالیف کی ہے کہ جانوروں کی زندگی و حالات میں اللہ تعالیٰ کی حکمت و قدرت کی جو نشانیاں پائی جاتی ہیں وہ عام انسانوں پر ظاہر ہو جائیں۔"

اس کتاب کے ذریعہ بھی مصنف نے اپنی وسعت علمی اور اپنے زمانہ کی مشہور ثقافتوں مثلاً عربی، یونانی، ایرانی اور ہندوستانی ثقافت کے بارے میں عدیم المثال واقفیت کا اظہار کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تمام ادیان اور ان کی تعلیمات مثلاً زرتشتی، یہودی، نصرانی، دہری اور اسلامی مذاہب کے فرقے اور ان کے درمیان کے تنازعات سے ان کی واقف اور باخبر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ وہ اپنے خیالات اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ براہ راست دل پر اثر پڑے اور آسانی سے سمجھ میں آ جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا بھی اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس کتاب میں وحدت فکر اور تاثر کی ہم آہنگی کا فقدان ہے۔ مصنف اس میں عالم اور ادیب زیادہ ہے فلسفی و حکیم کم نظر آتا ہے۔ اگرچہ کتاب میں مناظرہ و مجادلہ کے واقعات کی بھی کمی نہیں ہے۔

رسالة التربيع و التدبير

یہ رسالہ ۵۵ صفحات پر مشتمل ہے جو سب سے پہلے چند دیگر رسائل کے ساتھ ۱۹۰۳ء میں ہالینڈ سے شائع ہوا۔ پھر مصر سے اس کی اشاعت مجموعہ رسائل کے نام سے ۱۳۲۴ھ میں ہوئی۔ اس کی تیسری اشاعت بھی مصر ہی سے رسائل الجاحظ کے نام سے ۱۹۳۳ء میں ہوئی۔ اور یہی نسخہ اس وقت پیش نظر ہے۔

یہ رسالہ احمد بن عبد الوہاب کی ہجو میں لکھا گیا ہے۔ اس رسالہ میں بعض ایسے مسائل بھی ضمناً آ گئے ہیں جن کا تعلق منطق، فلسفہ، کیمیا، تاریخ اور حیوانات سے

ہے۔اس کے علاوہ اس میں قصہ اور مزاح و تفنن کے واقعات کی بھی خاصی کثرت ہے۔
اس رسالہ کا علمی وادبی اعتبار سے درجہ بہت بلند ہے۔اس سے جاحظ کے وسعت علمی کا
اندازہ ہوتا ہے جو تاریخ، قرآن، حدیث، فلسفہ اور یونانی، ہندی اور ایرانی علوم پر مشتمل
ہے۔اس میں جاحظ نے طنز وظرافت کا جو معیار قائم کیا ہے وہاں تک عربی کے بہت
ہی کم ادیبوں کی رسائی ہوئی ہے۔

رسائل الجاحظ

رسائل الجاحظ مطبوعہ مصر ۱۹۳۳ء میں جاحظ کے ۱۳ رسائل یکجا کر کے طبع
کرائے گئے ہیں جن میں سے ایک اہم رسالہ رسالة التربیع و التدبیر کا
تعارف گزشتہ سطروں میں ہو چکا ہے۔ بقیہ رسائل کے اسماء حسب ذیل ہیں:

خلاصہ کتاب العثمانیہ	خلاصہ نقض کتاب العثمانیہ
من کتاب فضل ہاشم علی عبد شمس	من کتاب حجج النبوت
من کتاب الحجاب	من کتاب استحقاق الامامة
من رسالة فی صناعات القواد	من کتاب فی النساء
من رسالة فی الشارب والمشروب	من رسالة فی مدح النبیذ
من رسالة فی بنی امیہ	من رسالة فی العباسیہ
من رسائلیہ الخاصة	

کتاب البخلاء

جاحظ کی تصنیفات میں سے ایک اہم اور مشہور و معروف کتاب ''کتاب
البخلاء'' بھی ہے۔یہ کتاب کئی بار طبع ہو چکی ہے۔سب سے پہلے اس کی طباعت
مستشرق Vanvelolen کے اہتمام سے ۱۹۰۰ء میں لیڈن (Ledon) میں ہوئی

پھر مصر اور دمشق میں شائع ہوئی۔ کتاب کا موضوع کتاب کے نام سے ہی ظاہر ہے۔ یعنی اس میں بخیلوں کے حالات درج ہیں۔ اور کہیں کہیں پر بخیل علماء و ادباء کے واقعات وقصص کی چاشنی بھی بڑے اچھے طنزیہ پیرایہ میں موجود ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سخاوت وبخل کا موازنہ اور عربوں کے عادات و اطوار بالخصوص ضیافت ومہمان نوازی کا بخوبی تذکرہ ہے۔

اگرچہ اس کتاب میں مصنف نے فطرت انسانی کے صرف ایک پہلو یعنی ''بخل'' پر بحث کی ہے لیکن اس مسئلہ پر معلومات کا جیسا ذخیرہ کتاب میں جمع کیا ہے اور کلام کو جتنا طول دیا ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مصنف کو اس کا کتنا مشاہدہ تھا۔ ان کے ذہن میں اخذ و جذب کی کتنی صلاحیت ہے۔ وہ انسان کے اعمال، اس کی نفسیات اور رجحانات سے کتنا باخبر تھے اور بخیلوں کی پوشیدہ سے پوشیدہ حرکتیں بھی ان کے سامنے کتنی واضح اور عیاں ہیں۔ اس کا مقصد ہجو برائے ہجو نہیں بلکہ وہ اس سے اصلاح نفس کا کام لینا چاہتے ہیں۔ اس لئے بخل کی مذمت کرتے ہوئے بھی مبالغہ سے کام نہیں لیتے بلکہ جہاں میانہ روی واعتدال کی خوبیاں بیان کرتے ہیں وہاں خود بھی قدم جادہ اعتدال سے باہر نہیں رکھتے۔

البتہ اس کتاب میں ایک کمی کا بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے کہ جاحظ نے قصص اور روایات مسلسل بیان کی ہیں مگر اس سلسلہ میں فنی ترتیب کا لحاظ قطعی نہیں رکھا ہے جس کی وجہ سے وحدت تاثر کا فقدان نظر آتا ہے۔

(ماخذ: وفیات الاعیان، تاریخ بغداد، معجم الادباء، الجاحظ، الفرق بین الفرق، الملل و النحل، معتزلہ، شزرات الذھب، بغیۃ الوعاۃ)

عبداللہ بن محمد الناشی

متوفی ۲۹۳ ھ

عبداللہ نام، ابو العباس کنیت اور ناشی لقب تھا۔ والد کا نام محمد انباری تھا۔ ان کے والد کو عرف عام میں شرشیر کہا جاتا تھا۔ بغداد سے دس فرسخ کی دوری پر دریائے فرات کے کنارے ایک شہر انبار تھا اسی شہر کو ان کے وطن ہونے کا فخر حاصل تھا۔ چنانچہ اسی وجہ سے انہیں انباری بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن اپنے وطن انبار سے ہجرت کر کے بغداد میں آ کر ایک طویل مدت تک قیام کیا۔ اور بغداد کی اقامت بھی انہیں راس نہیں آئی تو یہ مصر چلے گئے اور یہاں انہوں نے عمر کے بقیہ دنوں کو گزارا۔

بغداد چھوڑنے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ان کی تصنیفات اور خیالات ان کے ہم عصر علماء و شعراء اور عروضین وغیرہم کے مخالف تھے۔ چنانچہ انباری سے ان لوگوں کے اختلافات اتنے زیادہ بڑھے کہ اس نے عداوت کی شکل اختیار کر لی۔ اور انہیں بالآخر بغداد چھوڑ کر مصر میں مقیم ہونا پڑا۔ انہیں ناشی اکبر کے نام سے بھی مورخین یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ نحو، عروض، علم کلام اور شعر گوئی میں اساتذہ فن میں شمار کیے جاتے ہیں اور ابن رومی و بختری کے ہم پلہ تصور کیے جاتے ہیں۔

زود گوئی اور برجستگی میں یہ اپنا جواب آپ تھے۔ ابن ابی طاہر نے ناشی کی برجستگی اور موقع شناسی اور تصویر کشی کی بے انتہا تعریف کی ہے۔ مرزبانی نے لکھا ہے کہ ناشی کے اشعار تو بہت زیادہ ہیں لیکن ان سے امت کو فائدہ بہت کم پہنچا۔ مرزبانی نے ان کے اشعار کی کثرت کا تذکرہ اس لئے کیا ہے کہ ان کا صرف ایک قصیدہ جو از اول تا آخر ایک ردیف و قافیہ میں ہے، چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

ناشی کی وفات مصر میں ۲۹۳ ھ میں ہوئی۔ بقول ابن خلکان انہوں نے

بطور یادگار اپنی بہت سی تصانیف چھوڑیں جو علم کلام، منطق، نحو و عروض وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے علاوہ ناشی کے بہت سے اشعار بھی ہیں لیکن چونکہ ان کا میلان طبع سیر و شکار کی جانب زیادہ تھا اس لئے ان کے اشعار میں بھی شکار کرنے کے آلات اور شکار کے اقسام پر بحث ملتی ہے۔ ابن خلکان نے کتاب المصائد والمطارد کا اس سلسلہ میں حوالہ دیا ہے۔

(ماخذ: وفیات الاعیان، تاریخ بغداد)

ابن منجم

۲۴۱ھ --------- ۳۰۰ھ

نام ونسب

یحییٰ نام، ابو احمد کنیت اور عرف عام میں ابن منجم کہے جاتے تھے۔ والد کا نام علی المنجم تھا۔ ان کے دادا کا بھی نام یحییٰ ہی تھا۔

پیدائش ووطن

ابن منجم کی پیدائش ۲۴۱ھ میں ہوئی۔ ان کے آباو اجداد خلفاء اور رؤساء بغداد کے ندماء اور اہل دربار میں سے تھے۔ علماء بغداد کی نظروں میں علم وفضل کے اعتبار سے ممتاز تھے۔ اس لئے قرینہ اغلب ہے کہ ان کی پیدائش بھی بغداد ہی میں ہوئی ہو۔ اگرچہ اس بارے میں مورخین خاموش ہیں۔

ابتدائی تعلیم اور اساتذہ

ابن منجم نے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار ہی سے حاصل کی اور انتہائی تعلیم میں بھی کافی حد تک اپنے والد ہی کے شاگرد رہے۔ ان کے والد علی ابن یحییٰ کے

علاوہ ان کے اساتذہ کی فہرست حسب ذیل ہے:

زبیر بن بکار، احمد بن حارث الخزاز، اسحاق موصلی اور ابو ھنادیا ابی ھفان العبدی۔

تلامذہ

ابن منجم کے تلامذہ میں سب سے پہلے ان کے لڑکے یوسف کا نام آتا ہے اس کے بعد ان کے بھتیجے علی بن ہارون کا، جنہوں نے علم وادب، طرز رہائش اور عقائد غرض کہ ہر اعتبار سے اپنے چچا کی پیروی کی اور بحیثیت ایک مولف ومصنف کے کافی شہرت حاصل کی۔ ان کے علاوہ محمد بن احمد المکی اور ابو بکر الصولی بھی خاص طور پر ان کے شاگردوں میں قابل ذکر ہیں۔

دربار خلافت سے تعلق

ابن منجم کے اسلاف کا دربار خلافت سے جو تعلق تھا اسے ابن منجم نے بھی برقرار رکھا اور اپنی خصوصیات علمی و ادبی کی بدولت درباریوں میں سب سے زیادہ باعزت اور ممتاز تصور کیے جاتے تھے۔ ابتدا میں یہ موفق کے ہم جلیسوں میں تھے۔ موفق اگر چہ خلیفہ نہیں تھا لیکن معتمد علی اللہ کا بھائی اور نائب ہونے کی وجہ سے بااثر لوگوں میں سے تھا۔ چنانچہ اسی ذریعہ سے انہیں خلفاء کی قربت بھی حاصل ہوئی اور موفق کے وقت سے لے کر مکتفی باللہ تک یہ خلفاء کے ہم نوالہ وہم پیالہ رہے۔ سفر وحضر، سیر و تفریح اور شکار بازی غرضیکہ ہر موقع پر ابن منجم خلفاء کے ہم راہ رہا کرتے تھے۔ اور انہیں پوری آزادی حاصل تھی لیکن کبھی کبھی ان کی ضرورت سے بڑھی ہوئی بے تکلفی خلیفہ وقت کو ناگوار بھی گزرتی۔ اگر چہ اس سے ابن منجم کو کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن یہ وقتی طور پر الجھنوں میں مبتلا ہو جاتے۔ ایک واقعہ اسی ضمن میں اس طرح نقل کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ خلیفہ مکتفی باللہ دریائی راستہ سے شکار کرنے کی نیت سے روانہ ہونے کو تھا۔ اس کے ساتھ احمد بن عبد الصمد تھے۔ احمد نے ابن منجم کو ساتھ چلنے کو کہا۔ خلیفہ سے بے تکلفی کی وجہ سے یہ بھی بغیر اجازت لئے سفر کے لئے تیار ہو گئے۔ خلیفہ کو ابن منجم کا

بغیر اجازت کے جانا ناگوار معلوم ہوا۔ اس نے ابن منجم کے ہمراہ چند دوسرے لوگوں کو بھی مقام قرقیس میں شیر کے شکار کے لئے اتر جانے کا حکم دیا۔ یہ لوگ اتر گئے لیکن قسمت نے یاوری کی۔ ان لوگوں نے اپنی مدت قیام کے دوران ہی سات شیروں کا شکار کرڈالا۔ جب انہیں خلیفہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو بھی خلیفہ کی کبیدہ خاطری دور نہ ہوئی تو ابن منجم نے چند اشعار گانے والوں کو لکھ کر دیئے جو خلیفہ کے سامنے گائے گئے لیکن اس پر بھی خلیفہ نے کوئی توجہ نہیں دی۔ چنانچہ ابن منجم بھوک سے نڈھال ہو کر عبداللہ بن حسن کے پاس مقام رجستہ میں آ کر ٹھہر گئے اور شراب وغیرہ کا دور چلنے لگا۔ اس مجلس میں ابن زیات بھی شریک تھا۔ ان لوگوں کے مشورے سے ابن منجم نے قاسم بن عبداللہ وزیر مکتفی باللہ کو ایک خط لکھا۔ اس خط میں چند اشعار بھی حسب حال لکھ بھیجے اور یہ استدعا کی کہ ان اشعار کو خلیفہ کے روبرو پڑھ دیا جائے۔ ان میں سے بعض اشعار میں واقعہ کی جانب اشارہ کیا ہے اور اچھے انداز میں اپنے مدعا کو ظاہر کیا ہے۔ ان میں سے چند اشعار کا اردو ترجمہ کچھ اس طرح ہے۔

''لوگوں نے ہم کو درندوں کے شکار کے لئے مجبور کیا

حالانکہ میں خود ہی شکار کا شیدائی تھا

اگر ہم نے نافرمانی کی تو یہ حق تھا اس لئے کہ

جس قوم نے ہم کو اطاعت پر مجبور کیا اس نے خود ہی ہماری اطاعت کی

جس چیز پر انسان کو مجبور کیا جاتا ہے وہ ایسی ہی ہوتی ہے کہ

اس کی اطاعت قبول کرنا کوئی نہیں چاہتا ہے

تو ہمیشہ بادشاہوں سے مذاق کرتا رہا ہے لیکن باوجود ان مذاق کے

انعام واکرام کے دروازے کبھی تجھ پر بند نہیں ہوئے''

قاسم نے ان اشعار کو خلیفہ کے سامنے پڑھا تو خلیفہ نے اس کی تعریف کی اور قاسم کو یہ حکم دیا کہ ابھی اس کا جواب لکھ دو کہ ''فوراً بغداد کے لئے روانہ ہو جاؤ'' ابن منجم

کے پاس جب یہ حکم پہنچا تو وہ بغداد واپس آ کر مکتفی باللہ کے دربار میں حاضر ہوئے اور چند اشعار بطور مدح پھر خلیفہ کی خدمت میں پیش کئے جن کا ترجمہ یہ ہے:

"خلیفہ مکتفی باللہ کی نگاہ میں ہماری قدر ہے
اور کیوں نہ ہو جب کہ خلیفوں کی اولاد سے ہمیشہ اسی کی امید کی جاتی ہے"

لیکن اس واقعہ کے متعلق خود ابن منجم کا بیان ہے کہ دربار خلافت سے منسلک ہونے کے ابتدائی واقعات میں سے یہ واقعہ ہے۔ بہر حال اس واقعہ سے بہت سی باتیں اور ان کی خصوصیتیں روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ان کی بے تکلفی، سادگی اور ساتھ ساتھ اس واقعہ سے برجستگی بھی ظاہر ہے۔

ابن منجم عقیدتاً معتزلی تھے اور مسائل فقہ میں ابع جعفر ظہری کے متبع تھے۔

علم و فضل

علم و فضل کے اعتبار سے ابن منجم اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے۔ شاعری کا ذوق بہت پختہ تھا۔ دیگر علوم عرب و عجم پر بھی گہری نظر تھی۔ یہ اپنے اہل خاندان کی طرح خود بھی آسمان علم و ادب کے درخشندہ ستارہ تھے۔ ان کی مجلس میں ایک سے ایک عالم و فاضل جمع رہتے تھے، بالخصوص متکلمین کی خاصی تعداد رہتی تھی۔

وفات

ابن منجم کی وفات شب دوشنبہ مورخہ ۱۳ / ربیع الاول ۳۰۰ھ کو ہوئی۔

تصنیفات

ابن منجم کی تصنیفات میں سے ایک کتاب **کتاب الباھر فی اخبار شعراء محضر فی الدولتین** بھی ہے، جسے یہ مکمل نہ کر سکے تھے، لیکن ان کے لڑکے ابوالحسن احمد نے نہ صرف یہ کہ اسے مکمل کیا بلکہ شعراء و محدثین کے تذکرے اور سوانح کا اضافہ بھی کیا۔ اس کے علاوہ ابن منجم کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابوں کے اسماء آتے ہیں جو تحقیق کے بعد غلط ثابت ہوئے۔

کتاب اخبار اهله ونسبهم فی الفرس، کتاب الاجماع فی الفقه علی مذهب الطبری، کتاب المدخل الی مذهب الطبری و نصره مذهبه، کتاب الاوقاف

(ماخذ: معجم الادباء جلد ۲، تاریخ بغداد، وفیات الاعیان، فهرست ابن ندیم)

محمد بن عبدالوہاب جبائی

۲۳۵ھ -------- ۳۰۳ھ

نام محمد، کنیت ابوعلی۔ والد کا نام عبدالوہاب تھا۔ ان کا سلسلہ نسب اس طرح ہے۔ ''محمد بن عبدالوہاب بن سلام بن خالد بن حمران بن ابان''

جبائی کے اسلاف میں ابان نامی بزرگ حضرت عثمان بن عفانؓ کے غلاموں میں سے تھے۔ ان کا وطن بصرہ کا ایک گاؤں ''جبی'' تھا۔ یہ علاقہ خورستان سے متعلق تھا۔ بعض نے اسے نواحی بغداد میں شمار کیا ہے اور ابن جوقل کے حوالے سے ابن خلکان نے اسے ایک شہر بتایا ہے۔

جبائی کی ولادت بصرہ میں ۲۳۵ھ میں ہوئی اور وہیں انہوں نے ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد علم کلام کی تحصیل ابویوسف یعقوب بن عبداللہ شحام بصری سے کی۔ ان کے تلامذہ میں شیخ ابوالحسن علی بن اسماعیل اشعری خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن کا شمار مشہور متکلم کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ لیکن ان کے عقائد کا ان کے شاگرد ابو الحسن اشعری پر کوئی خاص اثر نہ پڑا۔ بلکہ وہ برابر جبائی کی مخالفت میں رہے۔ یہی نہیں

بلکہ جبائی اور اشعری کے درمیان کئی مناظرے بھی ہوئے جو متکلمین کے نزدیک بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ اشعری نے اپنے استاذ جبائی سے تین ایسے بھائیوں کے حشر کے بارے میں دریافت کیا جن میں سے ایک تو مومن متقی و پرہیزگار تھا۔ دوسرا کافر وفاسق اور بدبختی میں مبتلا تھا۔ تیسرا بچہ تھا جو حد بلوغ کو نہیں پہنچا تھا۔

جبائی نے جواب دیا کہ متقی کو اعلیٰ درجات عطا ہوں گے۔ کافر کو درک اسفل میں ڈالا جائے گا اور بچہ کو سلامتی مرحمت فرمائی جائے گی۔ ابوالحسن اشعری نے پھر دریافت کیا کہ بچہ کو زاہد کے درجات کیوں نہیں عطا ہوں گے؟ جبائی نے اس کا جواب یہ دیا کہ زاہد کو درجات اس کی عبادت وریاضت اور اطاعت کثیرہ کے عوض ملیں گے اور بچہ چونکہ عبادت وریاضت سے معذور ہے اس لئے اسے کیوں کر وہی درجات عطا ہوں گے جو زاہد کو ملیں گے۔ پھر انہوں نے بطور اعتراض جبائی سے سوال کیا کہ اگر بچہ یہ کہے کہ میں نے کوئی گناہ ہی نہیں کیا ہے ہمیں ان درجات سے کیوں محروم کیا جارہا ہے تو اس کا جواب جبائی نے اس طرح دیا:

کنت اعلم انک لو بقیت لعصبیت وصرت مستحقا للعذاب الالیم فراعیت مصلحتک ''مجھے معلوم تھا کہ اگر تو زندہ رہتا تو نافرمانی کرتا اور دردناک عذاب کا مستحق ہوتا اس لئے میں نے تیری مصلحت کی رعایت کی''

امام اشعری نے کہا کہ اگر کافر کا بھائی یہ کہے کہ اے اللہ تو جس طرح اس کے حالات سے باخبر ہے اسی طرح میری حالت سے بھی ہے لیکن تو نے میرے علاوہ اس کے مصالح کی جانب کرم فرمائی نہیں کی (یعنی اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا) جس کے جواب میں جبائی نے ابوالحسن اشعری کو مجنون کا خطاب دیتے ہوئے مباحثہ و مناظرہ ختم کردیا۔

اس مناظرے سے جہاں دو اہل علم اور متکلم کی گفتگو کا انداز معلوم ہوتا

ہے وہیں جبائی کے عقائد کی جھلکیاں بھی پائی جاتی ہیں، جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اللہ قادر مطلق ہے جس پر چاہے رحم کرے جسے چاہے عذاب میں مبتلا کرے۔ اللہ کے ان افعال پر کسی دلیل و حجت کی ضرورت نہیں۔ غرض کہ جب امام اشعری نے جبائی کی مجلسوں سے علیحدگی اختیار کر لی اور ان کے عقائد کی پیروی بھی نہیں کی تو اس کے ساتھ ہی ساتھ جبائی پر اعتراضات کا سلسلہ اشعری کی جانب سے شروع ہو گیا لیکن جبائی کے تبحر علمی کا اشعری کو بھی اعتراف تھا۔

جبائی کے علم و فضل اور حجیت قطعی سے متاثر ہو کر ایک جماعت ان کے عقائد کی پیروکار ہو گئی جسے فرقہ جبائیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جبائی کا شمار ائمہ معتزلہ اور راس المتکلمین میں ہوتا ہے۔ ان کے لڑکے ابو ہاشم عبدالسلام بھی اپنے والد ہی کے نقش قدم پر گئے اور انہوں نے جبائی کے عقائد کی اشاعت میں بڑی کدوکاوش کی۔ یہی نہیں بلکہ فرقہ جبائیہ کے تمام لوگ ابو علی جبائی کے بعد ابو ہاشم کے پیروکار ہو گئے۔

عقائد

جبائی نے اللہ کے بندوں کو مطیع قرار دیا اور یہ کہا کہ اللہ اپنے بندوں کی مرادیں اس لئے پوری کرتا ہے کہ وہ اس کے فرماں بردار ہیں یا مطیع۔ اس کے اسماء میں اس کے نام ''مطیع'' کا بھی اضافہ ہونا چاہئے۔ چنانچہ اس موضوع پر بھی امام اشعری اور جبائی کے درمیان بحث و مباحثہ ہوا لیکن جبائی اس خیال سے تائب نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ اللہ کے اسماء محض قیاس انسانی پر مبنی ہیں اور اللہ کے افعال کے مطابق اس کے اسماء بھی مقرر کئے گئے ہیں اس لئے اس کے افعال کو دیکھتے ہوئے چند اسماء کا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اللہ کی مرضی سے حمل قرار پاتا ہے اس لئے ''محبل النساء'' بھی کہا جائے گا۔

جبائی کا خیال یہ بھی تھا کہ ایک وجود کا مختلف مکانوں میں پایا جانا ممکن

ہے یعنی ایک شخص بہ یک وقت ہزاروں جگہ موجود ہوسکتا ہے اور اسی طرح ایک کلام کا وجود بھی ہزاروں جگہ ہوسکتا ہے۔ اور اسی دلیل کی بناء پر انہوں نے اپنے اس قول کی بھی عمارت کھڑی کی ہے کہ ''کلام مکتوب'' ایک جگہ موجود ہو اور اسے دوسری جگہ بھی لکھا جائے تو وہ بغیر پہلی جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوئے دونوں جگہوں میں پایا جائے گا۔ اسی طرح سے اگر اسے ہزاروں جگہ بھی لکھا جائے تو وہ ان تمام جگہوں پر پایا جائے گا۔

جبائی یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے تخلیق کردہ جہاں کو فنا کرنا چاہے تو اسے تمام اجسام و جواہر کو فنا کرنا ہوگا اور اسے اس بات پر قدرت حاصل نہیں کہ بعض جواہر کو فنا کرے اور بعض کو باقی رکھے۔ اگرچہ اس نے اس کی تخلیق علاحدہ علاحدہ کی ہے۔ کلام اللہ کے حادث ہونے کے متعلق یہ علماء بصرہ سے اختلاف کرتے ہوئے اسے باقی قرار دیتے ہیں۔

ان کی تصنیفات میں سے صرف ایک کتاب **کتاب فی الرد علی ابی الهذیل فی المخلوق و یکفره فیه** کا تذکرہ عبدالقاہر بغدادی نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ بقیہ تذکرہ نگار اس بارے میں خاموش ہیں۔

ابوعلی جبائی کی وفات ماہ شعبان ۳۰۳ھ میں ہوئی۔

(ماخذ: وفیات الاعیان، الفرق بین الفرق، الملل و النحل)

محمد بن زید واسطی

المتوفی ۳۰۶ ھ

محمد نام، ابوعبداللہ کنیت اور اپنے وطن واسط کی جانب منسوب ہو کر واسطی کے نام سے مشہور ہوئے۔ واسطی زید بن علی بن حسین واسطی کے لڑکے تھے۔

ابن خلکان نے ابن خانویہ کے قول پر اعتماد کرکے دو الگ الگ شخصیت ابوعبداللہ ابراہیم بن محمد بن عرفہ المعروف بہ نفطویہ اور ابوعبداللہ محمد بن زید واسطی کو ایک ہی شخصیت قرار دے کر فن تذکرہ نویسی کا خوب مذاق اڑایا ہے۔ حالانکہ بہ نظر غائر دیکھا جائے تو نام، نسب، سنہ وفات اور علمی صلاحیت غرض ہر اعتبار سے دونوں جدا جدا ہیں۔ ہاں صرف وطنیت کے لحاظ سے دونوں میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ نفطویہ کا سلسلہ نسب مورخین نے اس طرح لکھا ہے۔

''ابراہیم بن محمد بن عرفہ بن سلیمان بن مغیرہ بن حبیب بن مہلب بن ابی صفرۃ العتکی الاسری واسطی الملقب بہ نفطویہ النحوی''

اور محمد بن زید واسطی کا سلسلہ نسب مختصراً گزشتہ سطروں میں تحریر کر چکا ہوں۔ اس طرح نام کا اختلاف بھی ظاہر ہے۔ ایک کا نام ابراہیم بن محمد جبکہ دوسرے کا نام محمد بن زید ہے جو اس وقت ہمارے موضوع ہیں۔ سنہ وفات میں بھی بہت فرق ہے۔ محمد بن زید کی وفات ۳۰۶ ھ یا ۳۰۷ ھ میں ہوئی ہے۔ اس کے برعکس نفطویہ کی وفات ۳۲۳ ھ یا ۳۲۴ ھ میں ہوئی ہے۔

محمد بن زید واسطی ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ متکلم بھی تھے۔ ان کی شہرت ایک عظیم المرتبت متکلم ہونے کے اعتبار سے زیادہ ہوئی جبکہ نفطویہ کو کسی مورخ نے متکلم نہیں لکھا ہے۔ بلکہ ابن ندیم نے تو یہ لکھ کر فیصلہ کر دیا ہے کہ محمد بن زید واسطی کو

شاعری سے بھی ذوق تھا، انہوں نے دو شعروں میں نفطویہ کی ہجو بھی کی ہے۔ شعر حسب ذیل ہیں:

من سره ان لایری فاسقا فلیجتنب ان یری نفطویه

احرقه الله منصف اسمه وصیر الباقی مراخا علیه

ترجمہ: جو شخص اس بات سے خوش نہیں ہے کہ نفطویہ کو فاسق کہا جائے تو اس کو نفطویہ کو نفطویہ کہنے سے گریز کرنا چاہئے اس لئے کہ اللہ نے اس کے نصف کو جلا دیا ہے اور باقی کو اس کے اوپر چیخنے والا بنا دیا ہے۔

نہ معلوم ابن خلکان کی نگاہ اس اہم واقعہ پر کیوں نہیں پڑی۔ اس کے علاوہ بھی مذکورہ بالا دیگر شواہد و اختلاف کی موجودگی میں انہوں نے دو الگ الگ شخصیت کو ایک ہی گردانے کی کوشش کیوں کی اور ان کے تذکروں کو اس طرح خلط ملط کر دیا کہ ایک محقق کے لئے پریشانیوں کا دروازہ کھل گیا۔

بہر حال اس بحث کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ دونوں کو الگ الگ تصور کیا جائے ورنہ حقیقت تک رسائی میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔

محمد واسطی ابو علی جبائی کے شاگردوں میں تھے اور ان کے عقائد کے حامی بھی تھے۔ یہ اپنے زمانہ میں بہت معتبر شخصیت تصور کئے جاتے تھے۔ ان کی باتوں میں وزن ہوتا تھا۔ ان کے اصحاب مویئد تو بہت تھے لیکن ابو العباس کاتب کا ان میں نام سر فہرست ہے جو خود بھی علم کلام کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے اور جن کی تصنیفات میں سے کتاب نقض کتاب الارادہ صفة فی الذات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

آثار یہ بتاتے ہیں کہ واسطی اور نفطویہ کے درمیان یا تو جھگڑا تھا یا پھر دو بادشاہ در اقلیمے نہ گنجند کے مصداق تھے۔ تبحر علمی اور اقلیم علم و ادب کی سر یر آرائی کی وجہ سے دونوں میں نوک جھونک برابر ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ واسطی کی ہجو گوئی کا واقعہ گزشتہ سطروں میں مذکور ہوا۔ اس کے علاوہ ایک قول اور بھی واسطی کی

جانب منسوب ہے جس سے صریحاً تو نہیں لیکن در پردہ نفطویہ کی تضحیک و تذلیل کا اشارہ ملتا ہے۔

من اراد ان یتناھی فی الجھل فلیتعرف الکلام علی مذھب الناشی و الفقه علی مذھب داؤد بن علی. و النحو علی مذھب نفطویه

جو شخص اپنے جہل کی انتہا کرنا چاہتا ہے اسے **علم** کلام میں ناشی کی پیروی کرنی چاہئے اور فقہ میں داؤد بن علی کی اور نحو میں نفطویہ کے مذہب کو اختیار کرنا چاہئے۔

اس قول کے آخر کے الفاظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قائل نے نفطویہ کی تنقیص کا ارادہ کیا ہے لیکن اوپر کے دونوں اشارے سے بھی نفطویہ کے علم و فضل پر ایک چوٹ پڑتی ہے، اس لئے کہ نفطویہ علم کلام میں ناشی کی اور فقہ میں داؤد بن علی کی پیروی کرتے تھے۔

واسطی کی تصنیفات میں کتاب اعجاز القرآن اور کتاب الامامة نامی کتابیں مشہور ہیں جب کہ ان کے علاوہ بھی تصنیفات و نظمیں ہیں۔

واسطی کی وفات ۳۰۶ھ میں ہوئی۔

(ماخذ: وفیات الاعیان، فھرست ابن ندیم،

معجم الادباء، تاریخ بغداد)

عبداللہ بن احمد بلخی کعبی

متوفی ۳۱۹ ھ

عبداللہ نام، ابوالقاسم کنیت تھی۔ یہ احمد بن محمود الکعبی کے بیٹے تھے۔ ان کا نسبی تعلق قبیلہ بنی کعب سے تھا اس لئے انہیں کعبی کہا جاتا ہے۔ ملک خراسان کے ایک مشہور و معروف اور مردم خیز شہر بلخ کو ان کی وطنیت کا شرف حاصل ہے۔

کعبی کو علم کلام میں ابوالحسن بن عمرو خیاط سے تلمذ حاصل تھا۔ انہوں نے اپنے وطن بغداد کا سفر بھی کیا تھا۔ ایک عرصہ تک بغداد میں مقیم رہے تھے۔ ایک عالم متبحر اور متکلم کی حیثیت سے ان کی شہرت بغداد ہی کی مرہون منت ہے۔ عبدالقاہر بغدادی نے لکھا ہے کہ یہ علمی اعتبار سے شہرت حاصل کرنے کے قبل لکڑ ہارے (حاطب) کا کام کیا کرتے تھے۔

کعبی عقیدتاً معتزلی تھے، لیکن علماء بغداد کی جماعت میں شامل تھے۔ اپنے استاذ ابوالحسن خیاط کے عقائد کے پوری طرح حامی تھے۔ اگرچہ ان کے بعض اصولوں سے انہیں اختلاف تھا۔ اس اختلاف کی بناء پر انہوں نے ایک الگ جماعت کی قیادت شروع کر دی جسے علماء متکلمین کے نزدیک فرقہ کعبیہ سے موسوم کیا جاتا ہے، جو محض انہیں کے اختلافی عقائد کی بناء پر عالم وجود میں آیا۔ اسی وجہ سے ان کے نام کی طرف منسوب بھی ہوا۔ بغداد میں کعبی کے قیام کے درمیان ابوعبداللہ محمد بن عمران مرزبانی ان کے گہرے دوستوں میں سے ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب یہ بغداد سے اپنے وطن بلخ واپس آ گئے تو برابر ان دونوں کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔

کعبی کے مخصوص عقائد، جن کی بناء پر فرقہ کعبیہ قائم ہوا درج ذیل ہیں:

اللہ تعالیٰ کسی کے ذریعہ کسی چیز کو نہیں دیکھتا ہے بلکہ اسے ذاتی طور پر اس کا علم ہو جاتا ہے۔یعنی اللہ کو سمیع و بصیر کے معنوں میں کعبی نہیں مانتے ہیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ جس بات کو سننا اللہ کو مقصود ہوتا ہے اس کا علم اسے ہو جاتا ہے اس طرح سے دیکھنے کا بھی حال ہے۔ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے لئے کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرنا بھی حقیقی معنی میں صحیح نہیں، اس لئے کہ جب یہ کہا جائے کہ اللہ کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کام کو کرتا ہے۔یا اگر یہ کہا جائے کہ وہ کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کام کے کرنے کا حکم دیتا ہے اور یہ دونوں صورتیں مجازی ہوں گی۔جس طرح اس کے دیوار بنانے کا ارادہ حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی ہے۔کعبی کے نزدیک مقتول کو موتی میں شمار نہیں کیا جائے گا اسی طرح انہوں نے قول باری تعالیٰ کل نفس ذائقة الموت کی معنوی طور پر تکذیب کی ہے۔

خطیب بغدادی کے قول کے مطابق کعبی کی وفات بلخ میں یکم شعبان ۳۱۹ھ میں ہوئی۔لیکن ابن خلکان کی تحریر ان کے سن وفات سے متعلق مختلف ہے۔ان کے نزدیک کعبی کی وفات ۳۱۷ھ میں ہوئی۔

کعبی کی تصنیفات کے متعلق خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ بہت سی کتابیں ان کی تصنیف کردہ ہیں جن کی شہرت ان کے بغداد آنے کے بعد ہوئی، لیکن ان کی کتابوں کے اسماء اور موضوع کے متعلق کوئی نوٹ نہیں دیا ہے۔اور نہ ہی ان کی تصنیف کردہ کوئی کتاب ہی دستیاب ہو سکی جس سے کسی نتیجہ تک پہنچا جا سکے۔

(ماخذ: وفیات الاعیان، الملل و النحل، تاریخ بغداد، الفرق بین الفرق)

عبدالسلام بن محمد الجبائی

۲۴۷---------۳۲۱ ھ

نام ونسب

نام عبدالسلام اور ابو ہاشم کنیت تھی۔ یہ ابوعلی محمد الجبائی کے بیٹے تھے جنکا شمار کبار معتزلہ میں ہوتا تھا۔ جو اپنے عقائد وتصنیفات کی وجہ سے متکلمین کے نزدیک بلند مرتبہ، سرکردہ اور امام معتزلہ تصور کئے جاتے ہیں۔

وطن اور پیدائش

ابو ہاشم کا وطن جیسا کہ میں نے ان کے والد کے حالات کے ضمن میں لکھا ہے کہ بغداد نہیں تھا بلکہ یہ لوگ بصرہ کے ایک گاؤں ''جبی'' کے رہنے والے تھے، ابو ہاشم کی ولادت اسی گاؤں میں ۲۴۷ھ میں ہوئی۔

حصول تعلیم

ابو ہاشم کی ابتدائی تعلیم اور اساتذہ کے متعلق مورخین خاموش ہیں۔ لیکن ان کے عقائد پر ان کے والد کے عقائد کے اثرات بہت زیادہ تھے اس لئے یہ ممکن ہے کہ انہوں نے علوم دینیہ کی تکمیل اپنے والد ہی سے کی ہو۔

تلامذہ

ابو ہاشم کے تلامذہ میں ابوعبداللہ حسین بن ابراہیم بصری المعروف بہ جعل الکاغذی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، جن کا مکمل حال انشاءاللہ آئندہ آئے گا۔

علم وفضل

ابو ہاشم میں ذکاوت وفطانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ کسی معاملہ کو

اچھی طرح اور جلد سمجھنے کی صلاحیت پوری طرح کارخانہ قدرت سے انہیں ودیعت کی گئی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے عقائد کے بارے میں عجیب عجیب نکات نکالے اور ایک نئے فرقہ فرقہ ہشمیہ کی بنیاد رکھی جس کا شمار یوں تو فرقہ معتزلہ میں ہوتا ہے لیکن معتزلین سے عقائد میں اختلاف کی وجہ سے اسے اس نام سے موسوم کیا گیا۔ ان کے علم وفضل کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ یہ کسی کے اعتراض پر بھی جبیں پر شکن نہیں لایا کرتے تھے، بلکہ فوراہی مناسب و معقول جواب دے کر معترضین کا منہ بند کر دیا کرتے تھے۔ برجستگی اور موقع کی مناسبت سے گفتگو کرنے کی صلاحیت ان میں پوری طرح موجود تھی۔

ایک مرتبہ ان کے ساتھیوں نے ان سے کسی مسئلہ کے بارے میں دریافت کیا تو اس کا مناسب جواب دیا لیکن ان لوگوں نے بطور اعتراض یہ کہا کہ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ اس مسئلہ کے متعلق کچھ نہیں جانتے (جو اس طرح کا جواب دے رہے ہیں) اس کا جواب ابو ہاشم نے یہ دیا کہ ہر شخص اس بات سے باخبر ہے کہ میرے پاؤں کے پاس پانی کا گڑھا ہے اور میں بھی اس کو جانتا ہوں۔ لیکن میرے اور ہر شخص کے جاننے میں وہی فرق ہے جو ایک عالم اور جاہل کے جاننے میں ہوتا ہے۔ یعنی عالم جو کچھ جانتا ہے اسے جاہل اچھا سمجھتا ہے لیکن جاہل جو کچھ سمجھتا ہے اسے کوئی اچھا نہیں سمجھتا ہے۔

عقائد

شہرستانی کا قول یہ ہے کہ ابو ہاشم بہت سے مسائل میں اپنے والد کے عقائد کے حامی اور متبع تھے البتہ بعض مسائل میں ان سے اختلاف رکھتے تھے۔ شہرستانی نے دونوں باپ بیٹے کے درمیان جو متفق علیہ اور مختلف فیہ مسائل ہیں ان کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا ہے۔ چند مسائل میں یہ اہل سنت کی بھی موافقت کرتے ہیں جن میں سے ایک اہم مسئلہ اختیار امامت کا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ کرامت اولیاء اور عصمت انبیاء کے قطعی

قائل نہیں، بلا جرم کے یہ استحقاق دم اور سزا کے بھی قائل نہیں۔ چنانچہ اسی مناسبت سے ان نئے فرحہ کا دوسرا نام ''دمیہ'' بھی پڑا۔

ابو ہاشم کہتے ہیں کہ عذاب مسلسل ایک ہی بار نہیں ہوگا بلکہ دو قسطوں میں اس کی تکمیل ہوگی۔ گناہ کی حالت میں متواتر توبہ کرنا صحیح نہیں۔ مجبوری کی حالت میں اگر کوئی گناہ ہو جائے تو اس کی توبہ درست نہیں۔ کسی چیز کا ایک حیثیت سے ارادہ کرنا اور دوسری حیثیت سے ارادہ نہ کرنا جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کی موجودگی میں عالم کے ایک ذرے کو بھی فنا کرنے پر قادر نہیں۔ ان کے نزدیک طہارت واجب نہیں۔ اللہ عاصی کو اس کے اکتساب معصیت پر عذاب دے گا جو خود عاصی کی تخلیق نہیں۔

وفات

ابو ہاشم اپنے وطن سے منتقل ہو کر ۳۱۴ھ میں بغداد آ گئے تھے اور یہیں کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ بغداد ہی میں شب چہار شنبہ ۱۲ شعبان ۳۲۱ھ میں وفات پائی اور بستان کے قبرستان کے مشرقی حصہ میں دفن ہوئے۔ ابو ہاشم کے جنازہ میں قاضی حسن بن سہل نے شرکت کی تھی۔ ان کا بیان ہے کہ جب ان کی وفات ہوئی تو ایک جماعت کی شکل میں لوگ اکٹھا ہوئے تاکہ انہیں دفن کیا جائے۔ لوگ ان کے جنازہ کو اٹھا کر خیز ران کے قبرستان ایسی حالت میں لائے کہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اکثر لوگوں کو ان کی وفات کی خبر نہ ہو سکی۔ لوگ اس فکر میں تھے کہ ان کو دفن کیا جائے کہ اتنے میں ایک دوسرا جنازہ آیا جس کے ساتھ اہل علم اور ادباء تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دوسرا جنازہ ابوبکر بن درید کا ہے۔ غرض اس واقعہ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جس دن ابو ہاشم کو دفن کیا گیا اس دن بارش ہو رہی تھی اور اسی دن ابوبکر بن درید کا بھی انتقال ہوا۔

تصنیفات

ابن ندیم نے ابو ہاشم کی تصنیفات میں درج ذیل کتابوں کا تذکرہ کیا ہے

كتاب الجامع، كتاب الابواب الكبير، كتاب المسائل العسكريات، كتاب الابواب الصغير، كتاب اللسان، كتاب الجامع الصغير، كتاب العوض، كتاب النقص على ارسطاليس في الكون و الفساد، كتاب الطبائع و النقص على القائلين بها، كتاب الاجتهاد)

(ماخذ: تاريخ بغداد، وفيات الاعيان، الفرق بين الفرق، الملل و النحل، فهرست ابن نديم)

ابن الاخشید

المتوفی ۳۲۶ ھ

ابوبکر احمد بن علی بن معجور الاخشاد معتزلین میں خاصی شہرت اور صلحاء و زہاد کی صف میں نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔

ان کے جسم کا نچلا حصہ بالکل بیکار اور معطل تھا۔ زندگی بھر وہ اس سے کام نہ لے سکے۔ دو قدم چلنا محال تھا۔ لیکن اس مجبوری کے باوجود فصاحت و بلاغت ادب اور فقہ میں ایک خاص حیثیت رکھتے تھے۔

سوق عطش کے ایک کوچے میں جس کا نام ''درب اخشاذ'' تھا ان کا مکان تھا چنانچہ اسی نسبت سے یہ ابن الاخشد کے نام سے مشہور ہوئے۔

ابن الاخشد کا انتقال یکشنبہ مورخہ ۲۲ رشعبان ۳۲۶ھ میں ہوا۔ ان تصنیفات کا دائرہ بہت وسیع اور مختلف علوم وفنون پر محیط ہے۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ انہوں نے علم فقہ پر زیادہ توجہ دی اور اس فن میں ان کی کئی کتابیں ہیں جن میں سے چند مخصوص کتابیں درج ذیل ہیں۔

کتاب المبتدی، کتاب نقل القرآن، کتاب الاجماع،
کتاب النقض علی الحالدی فی الارجاء، کتاب اختصار،
کتاب ابی علی فی النفی و الاثبات، کتاب اختصار الطبر
کتاب المعونة فیالاصول

یہ آخری کتاب نامکمل ہے۔

(ماخذ: جملہ حالات ماخوذ از فهرست ابن ندیم)

ابوالحسن بن اسماعیل اشعری

۲۶۰ ---------- ۳۳۰ ھ

نام ونسب وخاندانی حالات

علی نام، ابوالحسن کنیت، والد کا نام اسماعیل اور دادا کا نام اسحاق اشعری تھا اسحاق اشعری کی کنیت ابواشعری تھی۔ ابوالحسن اشعری کا سلسلہ نسب آٹھ واسطوں سے حضرت ابوموسیٰ اشعری تک پہنچتا ہے، جو ایک جلیل القدر صحابی رسول ہیں۔ یہ یمن سے آکر مشرف بہ اسلام ہوئے اور مقام اشعر میں سکونت اختیار کی۔ چنانچہ اسی نسبت سے ابوالحسن اشعری خود اور ان کے آباواجداد اشعری کہلائے۔

ان کا گھرانہ ابتداء ہی سے اہل عرب میں ممتاز اور ذی علم شمار کیا جاتا تھا۔ تین پشتوں تک یہ لوگ عہدۂ قضاء پر فائز رہے۔ یہ خصوصیت بہت ہی کم خاندانوں کو حاصل ہوئی ہے۔

پیدائش ووطن

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے یمن کو خیر آباد کہہ کر اشعر کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنالیا تھا لیکن ان کے لڑکے ابو بردہ بہ سلسلہ ملازمت محکمۂ قضاء کوفہ میں منتقل ہوکر آ گئے۔ پھر جب ان کے پوتے بلال کو بصرہ کا قاضی بنایا گیا تو پورا خاندان بصرہ میں آ کر رہنے لگا اور یہیں کئی پشتوں کے بعد اس خاندان کی شہرت کو بام عروج پر پہنچانے والے ابوالحسن اشعری پیدا ہوئے۔ سنہ ولادت میں اختلاف ہے۔ خطیب بغدادی نے سنہ پیدائش ۲۶۰ھ لکھا ہے۔ ابن خلکان نے بعض مورخین کے حوالہ سے ۲۷۰ھ لکھا ہے لیکن اس (بعض) کی وضاحت نہیں کی ہے۔ راجح قول خطیب بغدادی کا معلوم ہوتا ہے

تعلیم واساتذہ

بصرہ میں ان کی علمی سرگرمیاں محدود تھیں حتی کہ مورخین نے انہیں احاطہ تحریر میں بھی نہیں لایا۔ جب یہ بصرہ سے منتقل ہوکر بغداد آگئے تو ابو اسحاق مروزی کے حلقۂ درس میں شریک ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ ان کے اساتذہ میں محمد بن عبدالوہاب جبائی کا نام بھی خصوصیت کے ساتھ آتا ہے۔

عقائد

حضرت ابوالحسن اشعری ابتداء میں معتزلین کے دلائل سے متاثر تھے لیکن جب انہیں ان کی غلطیوں کا احساس ہوا تو انہوں نے بصرہ کی جامع مسجد میں جمعہ کے دن اعلانیہ لوگوں کو مخاطب کر کے توبہ کی۔ مسئلہ خلق قرآن وغیرہ کا صاف صاف ذکر کر کے اس سے کنارہ کش ہوئے، نیز عقائد معتزلین وخوارج کے رد پر کمر بستہ ہوکر ان

کے قلع قمع کرنے کی جان توڑ کوششیں کیں۔تحریر وتقریر ہر میدان میں غلط عقائد کی دھجیاں اڑائیں اور عوام کے لئے مشعل راہ بنے۔

شہرستانی نے عقائد اشعریہ کی تفصیل اس طرح درج کی ہے۔

اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے۔ وہ جس صفت سے متصف ہے اس پر کامل قدرت رکھتا ہے۔اس کے گونا گوں صفات، اس کی قدرت وافعال پر دال ہیں۔وہ کسی کام کے لئے کوشش نہیں کرتا بلکہ اس کے اوصاف ہی اس بات کے ثبوت ہیں کہ وہ متعلقہ افعال کو بلا کسی جدوجہد کے انجام دیتا رہتا ہے۔

مثال کے طور پر اس کا عالم، سمیع وبصیر جیسے صفات سے متصف ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ان تمام اوصاف پر کمال رکھتا ہے۔اور بلا کسی روک ٹوک اور جدوجہد کے تمام باتوں کو جانتا ہے۔ ہر کام کے کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ ہر چیز کو دیکھتا ہے۔اس کی تمام صفتیں صفات ازلی ہیں جو اس کی ذات سے متعلق ہیں اور انہیں صفات میں صفت تکلم بھی ہے جو بنفس نفیس قدیم ہے البتہ اس کی تلاوت، تحریر، حروف وغیرہ حادث ہیں۔

بندہ اپنے افعال کا خالق نہیں کاسب ہے۔اس لئے کہ تخلیق محض اللہ کا کام ہے۔ بندہ کے اختیار میں صرف کسب ہے۔ وہ بھی ایسے افعال کا جو اختیاری ہیں۔ مثلاً ہاتھ پاؤں کا حرکت دینا۔ منہ کھولنا۔اور بھوک لگنے پر کھانا کھانا وغیرہ وغیرہ۔اللہ غنی مطلق ہے۔ اسے کوئی حاجت نہیں اور نہ اس کے خزانے میں کسی چیز کی کمی ہے۔ رویت باری تعالیٰ برحق ہے اس لئے کہ ہر موجود چیز دیکھی جا سکتی ہے اور خداوند قدوس موجود ہے اس لئے اس کا دیکھا جانا بھی لازمی ہے۔اس پر کلام اللہ کی آیت وجوہ یومئذ ناظرۃ الی ربھا اور حدیث ان المومنین یرونہ فی الآخرۃ دال ہے۔ لیکن رویت کس طرح، کہاں اور کون سی شکل میں ہوگی اس میں اختلاف ہے۔بعض یہ کہتے ہیں کہ دیکھنے کا علم مخصوصین کو ودیعت کیا جائے گا اور وہ عالم وجود میں رویت

باری سے مشرف ہوں گے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ رویت باری کا ذہن میں ادراک ہو جائے گا۔ ان کے نزدیک ایمان تصدیق بالقلب کا نام ہے۔ اقرار باللسان اور اعمال ایمان کے اجزاء ہیں۔ اس لئے جس شخص نے صدق دل سے خداوند قدوس کی وحدانیت کا اقرار اور نبی ﷺ کی رسالت کا اعتراف، اللہ کے احکام کو تسلیم کرتے ہوئے کرلیا تو اس کا ایمان مکمل ہو جائے گا اگر وہ فوراً وفات پا جائے تو وہ مومن ناجی ہوگا۔ اور جب تک خدا کی وحدانیت اور رسول کی رسالت کا منکر نہ ہو حدود ایمان سے خارج نہ ہوگا۔ نیز کوئی شخص اگر گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے کے بعد بغیر توبہ کئے وفات پا جائے تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے یا حضور ﷺ کی شفاعت سے بخش دے گا یا پھر اس کو اس کے گناہوں کی سزا ملے گی، اس کے بعد وہ شخص جنت میں داخل کیا جائے گا۔ بہر حال وہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں نہیں جائے گا۔ اور اگر اس شخص نے توبہ کر لی تو اللہ پر اس کی توبہ قبول کرنا واجب نہیں ہے، اس لئے کہ وہ مالک حقیقی قادر مطلق ہے کسی کا پابند یا ماتحت نہیں۔ اگر وہ تمام مخلوقات کو جنت میں ڈال دے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا، اسی طرح اگر وہ تمام لوگوں کو جہنم میں ڈال دے تو وہ ظالم نہیں ہوگا کیونکہ ظلم دوسرے کی ملکیت پر ناجائز قبضہ کرنے یا اسے مصرف میں لانے یا اس کو صحیح جگہ سے ہٹا کر غلط جگہ پر رکھ دینے کو کہتے ہیں۔ اللہ تمام چیزوں کا مالک ہے اس لئے اس کی جانب ظلم کی نسبت صحیح نہیں۔ علاوہ اس کے وہ کسی شخص کی مدح وذم کا محتاج نہیں۔ وہ اپنے بندوں پر لطف وکرم عذاب وثواب کرنے پر قادر ہے لیکن اس کا کسی پر فضل کرنا یا عذاب وعقاب میں مبتلا کرنا ظلم نہیں بلکہ عین انصاف ہے۔

اللہ تعالیٰ مدعی نبوت کو عوام میں پہچاننے کے لئے معجزات عنایت فرماتا ہے۔ معجزہ ایسے افعال کو کہتے ہیں جو خلاف قیاس انبیاء سے صادر ہو۔ کرامت اولیاء بر حق ہے، ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔

قرآن واحادیث میں جن غائب چیزوں کا تذکرہ ہے مثلاً لوح، قلم،

عرش، کرسی، جنت اور دوزخ وغیرہ اسی طرح آخرت کے متعلق جن چیزوں کا تذکرہ ہے مثلاً میزان، حساب، اور صراط وغیرہ پر ایمان ویقین واعتقاد ضروری ہے۔

ان کے نزدیک کلام اللہ بلاغت وفصاحت کے اعتبار سے اعجاز کا حامل ہے اور خلفاء کو جس ترتیب سے عامۃ المسلمین نے منتخب کیا (یعنی اول حضرت ابوبکرؓ ثانی حضرت عمرؓ ثالث حضرت عثمانؓ، رابع حضرت علیؓ) وہ ترتیب بالکل درست ہے۔ حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے کوئی غلطی نہیں کی اس لئے کہ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت عمرو بن عاصؓ نے حضرت امام سے کوئی بغاوت نہیں کی، نیز حضرت علیؓ ہر حال میں حق پر تھے۔

علم وفضل

حضرت ابوالحسن اشعری سب سے پہلے شخص تھے جنہوں نے معتزلہ کے عقائد کا مدلل ومسکت جواب دیا اور اس کی کاٹ کی۔ سچ تو یہ ہے کہ علماء اہل سنت و الجماعت کی کشتی اس وقت بیچ منجدھار میں تھی جس کو ابوالحسن اشعری نے اپنی علمی صلاحیت سے کنارہ پر پہنچایا۔ تحریر وتقریر ہر طرح سے انہوں نے ملحدین ومعتزلین، روافض وجہمیہ اور خوارج کے عقائد کی غلطیاں اور کمزوریاں عیاں کر کے مسلمانوں کو متنبہ کیا۔ انہی کوششوں سے اہل سنت والجماعت کا ایک مضبوط قلعہ تعمیر ہوا جس نے ملحدین سے خوب خوب ٹکریں لیں۔ مناظرے کئے اور ان کی ایک نہ چلنے دی۔ ابوالحسن اشعری کی ان خوبیوں کا اعتراف ان کے ہم عصروں نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ ابوبکر بن صیرفی کہتے ہیں کہ معتزلہ بری طرح سر اٹھائے ہوئے تھے اور ان کا پورا زور تھا اسی دوران اللہ نے حضرت ابوالحسن اشعری کو پیدا فرمایا جنہوں نے ان کا قلع قمع کر دیا۔

اشعری کے انداز بیان اور دلائل وبراہین کی قوت کا یہ عالم تھا کہ دشمن ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے تھے اور ابوالحسن کی اتباع میں ہی اپنی بھلائی سمجھتے تھے۔ چنانچہ رافضیوں کے سرکردہ عالم ابومالک الحضرمی اور علی بن ہیثم نے ان کے بعض

عقائد کو بہ سروچشم منظور کر لیا۔ ان کے علاوہ اسماعیل بن ابراہیم بن کبوس الشیر ازی الدیلمی نے اپنے فاسد عقائد سے ان کے ہاتھ پر اپنی پوری قوم کے ساتھ توبہ کی اور علماء حق کے ہاتھوں کو مضبوط کیا۔

ابو علی جبائی سے انہوں نے مختلف مواقع پر مناظرے کر کے اس فرقہ کے عقائد مذمومہ کا پول کھول دیا اور اس کی گرفت سے عوام کو بچائے رکھا۔ غرضیکہ انہوں نے علم کلام کے ذریعہ صحیح عقائد کی اشاعت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ بلکہ صحیح عقائد کی دیوار استوار کر کے اسے مزید طاقتور بنا دیا، جس کی وجہ سے مخالفین اور معاندین اہل سنت والجماعت کو شکست پر شکست کھانی پڑی۔

اشعری کے علم وفضل کا شہرہ سن کر قاضی ابوبکر باقلانی جیسے بڑے بڑے مایہ ناز عالم دور ونزدیک ہر جگہ سے آ کر ان کی جماعت اور درس میں شریک ہوئے، اور ان کی بے لوث خدمت دیکھ کر ان کے خیالات وعقائد کی اشاعت کا ذمہ اپنے سر لیا اور باد مخالف کو روکنے میں ان کے معاون ہوئے۔

وفات

اشعری کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ ان کی وفات ۳۲۲ھ مین ہوئی۔ جبکہ بعض کا خیال ہے کہ ان کا وصال ۳۲۴ھ میں ہوا البتہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ ان کا انتقال ۳۲۰ھ اور ۳۳۰ھ کے درمیان ہی ہوا ہے۔

مقام وفات اور مدفن

اشعری کی وفات بغداد میں ہوئی اور کرخ اور باب بصرہ کے درمیان شارع عام پر ایک مسجد کے گوشہ میں مدفون ہوئے۔ ان کی قبر کے نزدیک ایک حمام بھی ہے جو بازار کی جانب سے دریائے دجلہ تک جانے میں بائیں جانب پڑتا ہے۔

تصنیفات

اشعری کی تصنیف کردہ کتابوں کی تعداد ۵۵ بتائی جاتی ہے جن میں سے

اکثر معتزلہ، روافض، جہمیہ اور خوارج وغیرہ کے رد میں ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر کے نہ تو نام ہی معلوم ہو سکے اور نہ ہی وہ کتابیں دستیاب ہو سکیں۔ محض چند کتابوں کے اسماء کا تذکرہ ملتا ہے جو یہ ہیں۔

- کتاب اللمع، کتاب الموجز، کتاب ایضاح البرهان، کتاب التبيين عن اصول الدين، کتاب الشرح و التفصيل فی الرد علی اهل الافک و التضليل، کتاب الابانة عن اصول الديانة، رسالة استحسان الخوض.

مذکورہ بالا کتابوں میں سے صرف دو کتابیں ہی دستیاب ہو سکیں۔ کتاب الابانة اور رسالة استحسان الخوض

کتاب الابانة

اس کا ایک مطبوعہ نسخہ دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن کا شائع کردہ مدرسہ شمس الہدیٰ کی لائبریری میں موجود ہے۔ اس کتاب میں ایک سو ستاسی صفحات ہیں۔ ہر صفحہ پر تقریباً ۱۹ سطریں ہیں اور تقطیع اوسط میں ہے۔

حمد و ثناء کے بعد عقائد کی بحث ملتی ہے۔ اس بحث کی وجہ خود مصنف نے یہ بیان کی ہے کہ معتزلین اور قدریہ اپنے باطل عقائد کی اشاعت میں دن رات منہمک اور مشغول ہیں۔ وہ بھی ایسے باطل عقائد میں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اور اسلام کے قطعی منافی و مخالف ہیں چنانچہ ان کا رد کرنا ضروری معلوم ہوا۔ اور اسی لئے یہ کتاب احاطہ تحریر میں لائی گئی ہے۔ اس کے بعد مجمل طور پر ان عقائد باطلہ کی وضاحت کی ہے جو معتزلہ، قدریہ، جہمیہ اور مرجئیہ وغیرہ کے اصل الاصول ہیں۔ پوری کتاب ۱۷ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب عقائد کے لحاظ سے علاحدہ علاحدہ موضوع کا حامل ہے۔ لیکن بعض ابواب ایسے بھی ہیں جن میں ایک ہی موضوع کے متعلق تسلسل پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر پانچواں، چھٹا اور ساتواں صرف کلام اللہ سے متعلق

ہے۔ حمد ونعت کے بعد پہلا باب ''باب فی ابانة قول اھل الضیغ و البدعة''
کے عنوان سے ہے۔ اور کتاب کا اختتام امامت حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بحث اور
تصدیق پر ہوتا ہے۔

رسالہ استحسان الخوض

مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن ۱۳۴۴ھ مملوکہ خدا بخش لائبریری۔
یہ رسالہ محض ۱۲ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ پر اوسطاً ۲۱ سطریں ہیں۔ اس مختصر سے
رسالہ کے آخری راوی (جن پر روایت کی سند ختم ہوتی ہے) امام جمال الدین ابوالحسن
بن ابراہیم بن عبد اللہ قرشی ہیں۔ سند کتاب کے بعد تیسرے صفحہ سے کتاب کی اصل
عبارت شروع ہوتی ہے جو اس طرح ہے:

اما بعد فان طافة من الناس جعلوا الجهل رأس مآلهم و نقل
عليهم النظر و البحث عن الدين وصالوا الى التحفيف و التقليد
وطعنوا على من فطش عن اصول الدين و نسبوه الى الضلال وزعموا
ان الكلام فى الحركة و السكون و الجسم و العرض والا لوان والا
كوان والجزء والظفرة وصفات البارى بدعة و ضلالة۔

امابعد لوگوں کی ایک جماعت نے اہم کاموں میں جہالت کو اختیار کر رکھا
ہے اور یہ بیان کرتے ہیں کہ نظر و بحث دین میں سے ہے اور تحفیف تقلید پر متحد ہو گئے
ہیں اور جو شخص اصول دین سے علیحدہ ہے اس پر طعن کرتے ہیں اور اسے گمراہ کہتے ہیں
اور یہ گمان رکھتے ہیں کہ حرکت، سکون، جسم عرض، لون، کون، جزء، ظفر اور صفات
خداوندی کے متعلق کلام کرنا بدعت اور گمراہی ہے۔

اس عبارت کے نقل کرنے کا مقصد جہاں یہ ہے کہ انداز تحریر اور پیرایہ
آغاز کا علم ہو وہیں یہ بھی معلوم ہو جائے کہ رسالہ کا اصل موضوع کیا ہے اور اس کے
لکھنے کا محرک کون سا واقعہ ہوا ہے۔

(ماخذ: وفیات الاعیان، تاریخ بغداد، الملل والنحل، الفرق بین الفرق)

ابو منصور ماتریدی

متوفی ۳۳۳ ھ

نام ونسب:

محمد نام، ابومنصور کنیت اور امام الہدیٰ لقب تھا۔ یہ محمد بن محمود ماتریدی کے فرزند تھے۔

وطن

ماترید سمرقند کا ایک محلہ یا گاؤں تھا جس کو ان کے وطن ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ چنانچہ اسی نسبت سے امام محمد اصل نام کی بہ نسبت ماتریدی سے زیادہ مشہور ہوئے۔

اساتذہ

ماتریدی نے علم فقہ کی تکمیل ابوبکر احمد جوز جانی سے کی۔ ان کے علاوہ امام ابونصر عیاضی، نصیر بن یحییٰ بلخی اور محمد بن مقاتل رازی قاضی رے کا نام خصوصیت کے ساتھ ان کے اساتذہ کرام کی فہرست میں شامل ہے۔

تلامذہ

امام ماتریدی کے عقائد کے متبع اور احسان مند ویسے تو تمام حنفی المسلک ہیں لیکن اصل میں ان کی شاگردی کا شرف مندرجہ ذیل تین باکمال لوگوں کو حاصل ہوا (۱) حکیم قاضی اسحاق ابن محمد سمرقندی (۲) علی رستغنی (۳) ابومحمد عبدالکریم ابن موسیٰ بزدوی۔

علم وفضل

امام ماتریدی نہ صرف یہ کہ متکلمین کے امام تھے بلکہ ان کا شمار مشائخ کبار اور صاحب طریقت بزرگوں میں ہوتا ہے۔ زہدو ریاضت میں اپنی مثال آپ

تھے۔سب سے بڑی خصوصیت جس کی وجہ سے دیگر متکلمین پر انہیں فوقیت حاصل ہوئی یہ تھی کہ ان کا دور کھلے لفظوں میں گمراہی اور ضلالت کا دور تھا۔علماء اہل سنت والجماعت کے مقابلہ میں معتزلین کے دیگر فرقے برسر اقتدار تھے۔انہیں علم کلام پر عبور حاصل تھا اس وجہ سے اپنے دلائل و براہین کے ذریعہ عوام کے عقائد پر اثر انداز ہونے کے کافی مواقع حاصل تھے جس سے وہ پوری طرح فائدہ اٹھا رہے تھے۔لیکن ایسے ہی ناموافق حالات میں ''مردے از غیب برون آید و کارے بکند'' کے مصداق امام ماتریدی نے علماء حق کے عقائد کو دلائل و براہین کے ذریعہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔بحیثیت مجموعی انہیں امام اہل سنت والجماعت کا درجہ حاصل ہے،لیکن یہ جس قدر حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک سے متاثر ہوئے دوسرے ائمہ کے عقائد نے انہیں اتنا متاثر نہیں کیا۔اسی وجہ سے عقائد حنفیہ ہی کو انہوں نے اختیار کر کے معتزلین اور اہل بدعت سے خوب خوب مناظرے کئے اور انہیں اپنے دلائل قطعی سے بری طرح شکست پر شکست دی۔دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ انہوں نے نئے انداز میں دین بر حق کا احیاء کیا۔چنانچہ اسی وجہ سے بعض حضرات نے انتہاء غلو میں انہیں امام مہدی تک کہہ دیا۔اگرچہ امام ابوالحسن اشعری کو متکلمین اہل سنت والجماعت کے درمیان جو مقبولیت حاصل تھی وہ امام ماتریدی کو حاصل نہ ہوسکی۔بالخصوص احناف کو جو عقیدت وتعلق امام اشعری سے پیدا ہوگیا اس کا عشر عشیر بھی امام ماتریدی سے نہیں تھا حالانکہ اکثر مسائل میں امام اشعری امام شافعی کے ہم نوا و ہم خیال اور متبع تھے۔برخلاف اس کے عقائد حنفیہ کا کامل پیرو اگر کوئی تھا تو وہ امام ماتریدی تھے اور انہی کی کوششوں اور علمی صلاحیتوں کی بنیاد پر مسلک حنفیہ جو متکلمین کے اعتراضات واختلافات اور مناقشات کی تاب نہ لاکر گوشہ نشیں ہو چکا تھا ایک بار پھر ابھرنے کا اسے موقع ملا۔اور علماء حق کو بھی اس سے اپنے عقائد کی اشاعت کی دعوت عام ملی۔

امام ماتریدی کے علم وفضل کا یہ عالم تھا کہ ابونصر عیاضی کے چالیس

شاگردوں میں یہ ہمیشہ ممتاز رہے اور عیاضی کی وفات کے بعد جو دینی خدمت انہوں نے انجام دی وہ کسی کے حصہ میں نہ آئی۔

زہد وتقویٰ وکرامات

امام ماتریدی کے متعلق صاحب حدائق الحنفیہ رقم طراز ہیں کہ ''مشائخ کبار میں سے بڑے محقق و مدقق، متکلمین کے امام اور عقائد مسلمین کے مصلح، عابد وزاہد متحمل صاحب کرامات تھے۔ آپ کے زمانہ میں ریاست مذہب امام ابوحنیفہ آپ پر منتہی تھی۔'' ماتریدی کے صاحب کرامت ہونے کے ثبوت میں ایک واقعہ بھی اس طرح درج کیا ہے کہ ان کے زہد وورع اور تقویٰ وپرہیز گاری کا صحیح اندازہ ہو جائے:

''آپ کے زمانہ میں ایک بادشاہ بڑا ظالم تھا اور لوگ اس سے بہت تنگ آ چکے تھے، یہاں تک کہ زمینداروں کا ایک گروہ اس کے ظلم وستم سے تنگ آ کر آپ سے شکایت کے ارادہ سے آپ کے گھر پہنچا، لیکن آپ اس وقت گھر میں نہیں تھے۔ آپ کی عورت نہایت بد خلق تھی۔ وہ زمینداروں کو مہمان سمجھ کر نہایت سختی سے پیش آئی۔ زمیندار یہ معلوم کر کے کہ آپ باغ میں ہیں باغ میں چلے آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ آپ کسی سے باغ کی زمین درست کر رہے ہیں۔ آپ نے ان لوگوں کو دیکھ کر فرمایا کہ شاید آپ لوگوں کو میرے گھر کے کتے نے کاٹا ہوگا۔ پھر آپ باغ سے زرد آلو کا طبق بھر لائے اور زمینداروں کے آگے رکھ دیا۔ چونکہ موسم سرما کا تھا۔ زمیندار غیر موسم میں زرد آلو دیکھ کر حیران ہو گئے اور آپ سے دریافت کیا تو آپ نے جواب دیا کہ میں نے اپنے دائیں ہاتھ سے کوئی گناہ نہیں کیا اس لئے جو چیز اس کے ذریعہ سے چاہتا ہوں وہ حاصل ہو جاتی ہے۔ پھر آپ نے گھاس سے کمان اور تنکے سے تیر بنا کر ظالم بادشاہ کی طرف پھینکا۔ زمینداروں نے تاریخ لکھ لی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بادشاہ اسی دن مقتول ہو گیا تھا۔''

جیسا کہ اوپر کی سطروں سے معلوم ہوا کہ ان کی اہلیہ بہت سخت مزاج تھیں

چنانچہ اکثر انہیں بھی ان کی سخت مزاجی کی وجہ سے پریشانیوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ پھر بھی صبر وتحمل کا دامن ان کے ہاتھ سے نہ جاتا تھا۔ بلکہ ان کی اس بدمزاجی کو آزمائش من جانب اللہ تصور کرتے ہوئے اس آزمائش میں پورا اترنے کی سعی بلیغ فرماتے تھے۔ جس کا اجران کو دنیا ہی میں یہ ملا کہ ان کے مراتب مزید بلند ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ زمینداروں ہی کے سلسلے میں یہ بھی درج ہے کہ پھر کچھ تازہ شلغم مہمانوں کی ضیافت کے لئے گھر میں لائے آپ کی اہلیہ آپ کے ساتھ نہایت سختی سے پیش آئیں آخر جب انہوں نے دیکھا کہ آپ ناچار ہیں تو آپ کو کہا کہ آگ روشن کرو۔ آپ آگ روشن کرنے لگے ہوا بڑی تیز تھی اس لئے آگ روشن نہ ہوسکی۔ اہلیہ نے غصہ میں آکر چھ سات لاتیں آپ کو ماریں چنانچہ ہر لات کے بدلہ ایک ایک پردہ اٹھتا گیا۔ آپ نے فامایا کہ اگر ایک لات اور مارتیں تو تمام حجابات ختم ہوجاتے۔ کہتے ہیں کہ کچھ دنوں کے بعد ہی سخت مجاہدہ کے بعد آخری پردہ بھی اٹھ گیا۔

عقائد

امام ماتریدی عقائد کے اعتبار سے احناف کے امام تصور کیے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس امام اشعری کے بہت سے مسائل علماء احناف کے عقائد کے مطابق نہیں۔ چنانچہ جن خاص خاص مسائل میں ان دونوں کے درمیان اختلاف ہے انہیں علماء نے شمار کرنے کی کوشش کی ہے۔

بعضوں نے ۳ بعضوں نے ۱۳ اور بعضوں نے ۴۰ کی تعداد بتائی ہے۔ لیکن علامہ ابن البیاضی نے زیادہ چھان بین کے بعد ۵۰ مختلف فیہ مسائل نکالے ہیں، جن میں سے اہم مسائل کو چھانٹ کر علامہ شبلی نعمانیؒ نے اپنی کتاب ''علم الکلام'' میں درج کیا ہے جو درج ذیل ہیں:

(۱) اشیاء کا حسن وقبح عقلی ہے۔
(۲) خدا کسی کو تکلیف مالا یطاق نہیں دیتا۔

(۳) خدا ظلم نہیں کرتا۔ اس کا ظالم ہونا عقلاً محال ہے۔

(۴) خدا کے تمام اعمال مصالح پر مبنی ہیں۔

(۵) آدمی کو اپنے افعال پر قدرت واختیار حاصل ہے اور یہ قدرت ان افعال کے وجود میں اثر رکھتی ہے۔

(۶) ایمان کم اور زیادہ نہیں ہوتا۔

(۷) زندگی سے ناامیدی کی حالت میں بھی توبہ مقبول ہے۔

(۸) حواس خمسہ سے کسی چیز کو محسوس کرنا علم نہیں بلکہ ذریعہ علم ہے۔

(۹) اعراض کا اعادہ نہیں ہو سکتا۔

مرض الموت اور خشیت الٰہی

امام ماتریدی انتقال سے قبل مرض اسہال میں مبتلا ہو گئے تھے۔ چنانچہ جس روز ان کا انتقال ہوا انہیں ستر مرتبہ حدث اکبر لاحق ہوا۔ لیکن ان کے تقویٰ، پرہیز گاری خشیت الٰہی اور مجاہدہ کا یہ عالم تھا کہ ایسے حال میں بھی ہر بار وضو کرتے رہے۔ لوگوں نے کہا کہ آپ ایسی تکلیف مالا یطاق میں کیوں مبتلا ہو رہے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ ”آج میری وفات کا دن ہے اس لئے میں نہیں چاہتا کہ بے وضو انتقال کروں کیونکہ رسول خدا ﷺ کا قول ہے کہ باوضو مومن اور بے وضو منافق ہوتا ہے۔ لہذا میں اس وعدے کی امید اور وعید کے خوف سے وضو کرتا ہوں“ امام ماتریدی کی وفات ۳۳۳ھ میں ہوئی اور ان کے جسد خاکی کو سمرقند میں سپرد خاک کیا گیا۔

تصنیفات

امام ماتریدی کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے:

کتاب التوحید، کتاب المقالات، کتاب رد نهل الادلة الکعبی،

کتاب بیان اوهام المعتزله، کتاب تاویلات القرآن،

کتاب رد الاصول الخمسة ابی محمد باهلی، کتاب رد الامامة

بعض روافض، کتاب الرد قرامطه، کتاب ماخذ الشرائع (فقہ میں)

کتاب الجدل (اصول فقہ میں)

کتاب مذکورہ بالا میں سے علامہ شبلی کی تحریر کے مطابق صرف تاویلات قرآن کا ایک نامکمل نسخہ ان کی نظر سے گزرا ہے۔ لیکن اس پر کوئی نوٹ دینے سے انہوں نے گریز کیا ہے، ہاں اس کے متعلق جواہر مضئیہ میں یہ عبارت ملتی ہے۔

ھو کتاب لایوازیہ فیہ کتاب بل لابدایتہ شیء من تصانیف من سبقہ فی ذالک الفن (تاویلات قرآن ایک ایسی کتاب جو اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ بلکہ اس فن میں جو تصانیف پہلے ہو چکی ہیں کوئی اس کی برابری نہیں کرسکتی)

(ماخذ: جواھر المضئیہ، شرح اسرار احیاء العلوم، طبقات الاحناف، طبقات السادہ جمال حنفیہ، حدائق الحنفیہ، علم الکلام)

❁❁❁❁❁

علی بن محمد التنوخی

۲۷۸ ------- ۳۴۲ ھ

نام و نسب

علی نام اور کنیت ابو القاسم تھی۔ ان کا سلسلہ نسب ان کے پوتے کی روایت کے مطابق خطیب بغدادی اس طرح لکھتے ہیں:

''علی بن محمد ابی الفہم داؤد بن ابراہیم بن تمیم بن جابر بن ہانی بن زید بن عبید بن مالک بن مریط بن سرح بن نزار بن عمرو بن الحارث بن صبح بن عمرو بن الحارث بن عمرو فہم بن یتیم اللہ بن اسد بن دمرہ بن تغلب بن حلوان بن عمران بن الحاف بن قضاعۃ''

تنوخ کے نام سے بحرین میں بسنے والے چند قبائل تھے جن کی جانب نسبی تعلق ہونے کی وجہ سے تنوخی لقب پڑا۔

پیدائش اور وطن

تنوخی کی ولادت ملک شام کے پایہ تخت انطاکیہ میں یکشنبہ مورخہ ۲۶ رذی الحجہ ۲۷۸ھ میں ہوئی۔ ان کے آباء واجداد بھی ملک شام ہی کے رہنے والے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تنوخی کو بھی اپنے ملک سے قلبی لگاؤ اور دلی محبت تھی جس سے مجبور ہو کر انہوں نے رات ورات چھ سو اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ زبانی یاد کرلیا جس میں ملک شام یا یمن کی خوبیوں اور اہل یمن کے فخر و مباہات کا تذکرہ تھا۔

تعلیم واساتذہ

ابتدائی تعلیم اور اساتذہ کا حال پردہ خفاء میں ہے۔ اپنے وطن انطاکیہ میں تنوخی نے جن حضرات سے حدیث کی سماعت کی ہے ان کے اسماء حسب ذیل ہیں:

حسن بن احمد حبیب کرمانی (صاحب مسدد) احمد بن خلید حلبی (صاحب ابی الیمان حمصی) احمد بن محمد بن ابی موسیٰ انطاکی، انس بن سالم خولانی، حسن بن احمد بن ابراہیم بن فیل، فضل بن محمد عطاء انطاکی، حسین بن عبداللہ قطان ارقی، احمد بن عبداللہ بن زیاد حلبی، محمد بن حسن الالوسی۔

جب تنوخی انطاکیہ کے علماء ومحدثین سے پوری طرح استفادہ کر چکے تو یاقوت حموی کی روایت کے مطابق ۳۰۶ھ میں اور عبدالقادر قریشی کے مطابق ۳۰۹ھ میں عازم بغداد ہوئے اور وہاں پہنچ کر مندرجہ ذیل کبار محدثین اور ارباب علم وفن کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر کے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔

حسن بن طیب شجاعی، عمرو بن غیلان ثقفی، محمد بن محمد باغندی، حامد بن شعیب بلخی، ابوقاسم بغوی، ابوبکر بن داؤد وغیرہم۔

تلامذہ

حصول علم سے فراغت کے بعد تنوخی نے درس حدیث کے سلسلہ کا آغاز کیا۔ ان کے اہل خانہ اور اولاد و امجاد کے علاوہ ابو حفص بن الاجری اور ابو القاسم الثلاج کے اسماء خاص طور پر ان کے تلامذہ کی فہرست میں آتے ہیں۔

اولاد و امجاد

تنوخی کے خاندان کا ہر فرد علم و ادب کے آسمان پر درخشاں ستارہ بن کر چمکا ان کے لڑکے قاضی ابوعلی محسن نہ صرف یہ کہ ایک عالم اور فقیہ تھے بلکہ اپنے دور کے ممتاز شعراء و ادباء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ابوعلی محسن کی ولادت بصرہ میں ۳۲۷ھ میں ہوئی تھی۔ حصول تعلیم سے فراغت کے بعد قصر و بابل کے قاضی کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ پھر خلیفہ مطیع اللہ نے انہیں مکرم، ایذج اور رامہرمز کا قاضی مقرر کیا۔ پھر وقتاً فوقتاً ان کے عمل میں تبدیلی اور اضافہ بھی ہوتا رہا۔ یہ جس حد تک علم دوست تھے اس سے کہیں زیادہ غریب پرور اور سخی بھی تھے۔ عام طور پر غرباء و مساکین کی اعانت میں پیش پیش رہا کرتے تھے۔ ان کی وفات محرم الحرام ۳۸۴ھ میں بغداد ہی میں ہوئی

ابوعلی محسن کے عربی اشعار کے علاوہ چند کتابیں بھی بطور یادگار ہیں۔ لیکن ان کی زبردست یادگار ان کے صحیح جانشیں اور خاندان کا نام روشن کرنے والے ان کے فرزند ارجمند ابو القاسم التنوخی تھے جنہوں نے اپنے اسلاف کی پیروی میں علم و ادب سے انتہائی محبت کا ثبوت دے کر اس بیان کو ایک بار پھر سچ کر دکھایا کہ تنوخی کے خاندان کا ہر شخص ایک روشن شمع ہے جس سے ایک دنیا روشن اور منور ہو رہی ہے۔ اور کوئی بھی فضل و کمال میں کسی سے پیچھے نہیں تھا۔

منصب قضاء

تنوخی سب سے پہلے مقتدر باللہ کے زمانہ میں قاضی بنائے گئے۔ پھر خلیفہ

مطیع اللہ کے عہد میں انہیں قاضی القضاۃ کا منصب سپرد کیا گیا۔ اور اہواز، واسط، کوفہ اور حمص کے علاقے ایک عرصہ تک ان کے زیر اثر اور ماتحتی میں رہے۔

عقائد

فقہی مسائل میں مورخین تنوخی کو امام ابو حنیفہ کا پیرو لکھتے ہیں لیکن عقائد و اصول علم کلام کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہ معتزلین کے ہم خیال تھے۔ چنانچہ تاریخ بغداد کی عبارت اس طرح ہے۔

وکان یعرف الکلام فی الاصول علی مذاهب المعتزله (اور وہ مذہب معتزلہ کے مطابق اصول علم کلام جانتے تھے)

علم و فضل

علم و فضل کے اعتبار سے تنوخی کی مثال ناممکن تو نہیں پر مشکل ضرور ہے۔ ان کے ایام طفولیت یا طالب علمی کے زمانہ کا ایک واقعہ ان کی خداداد صلاحیت و ذہانت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تنوخی ۱۵ رسال کے تھے تو دعیل بن علی کے چند قصائد جن میں ملک یمن کی تعریف و توصیف تھی یہ اپنے استاذ سے پڑھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک قصیدہ جس کا پہلا شعر انہیں بہت پسند آیا یہ ہے۔

اکفی من ملامک یاظعینا　　　　کفاک اللوم مرالا ربعینا

(اے کوچ کرنے والے محبوب اپنی ملامت سے باز آ۔ اور اپنی اس ملامت کو بند کر جو چہل سالہ ہونے کی وجہ سے تلخ ہوگئی ہے)

یہ قصیدہ تقریباً چھ سو اشعار پر مشتمل تھا۔ لیکن منا خریمن کی وجہ سے ان کے دل میں اس کو زبانی یاد کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور استاد سے انہوں نے اس خیال کا اظہار کر کے قصیدہ طلب کیا لیکن ان کے استاذ نے اسے کوئی اہمیت نہ دی اور ان کی صغر سنی کی وجہ سے قصیدہ ان کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ کچھ رد و کد کے بعد انہیں قصیدہ مل تو گیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ صرف پچاس اشعار ایک دن میں یاد کر کے

قصیدہ واپس کر دیں۔ یہ قصیدہ کی کتاب لے کر اپنے کمرہ میں چلے گئے اور ایک دن رات اس کے حفظ کرنے میں مشغول رہے۔ اور جب وقت مقررہ پر استاذ کے سامنے کتاب واپس کرنے کے لئے حاضر ہوئے تو انہیں پورا قصیدہ یاد ہو چکا تھا۔ ان کے استاذ کو تنوخی کی قوت حافظہ پر کچھ شبہ ہوا تو انہوں نے طیش میں آ کر جستہ جستہ اشعار تنوخی سے سنے اور یہ صحیح صحیح سناتے چلے گئے۔ تب ان کے استاذ کو ان کے قوت حافظہ کا علم ہوا۔ اور انہوں نے انتہائی خلوص ومحبت اور مسرت وشفقت میں تنوخی کی پیشانی کو چوم لیا اور اس بات کی ہدایت کی کہ اپنے اس کمال کا چرچہ نہ کریں ورنہ نظر لگ جائے گی۔

اس کے علاوہ انہیں ابوتمام اور بختری کو چھوڑ کر شعراء محدثین کے سو قصائد زبانی یاد تھے۔ ابوعلی تنوخی کی روایت کے مطابق انہیں شعراء طائین کے سات سو قصائد اور قطعات یاد تھے۔ شعراء ومحدثین مخضرمین اور جاہلین کے کلام اس کے علاوہ تھے۔

تنوخی نحو ولغت، علم الفقہ اور علم الفرائض میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ اور علم کلام، نجوم، ہندسہ، منطق اور علم ہیئت پر بھی عبور حاصل تھا۔ حفظ حدیث کا یہ عالم تھا کہ ان کے عہد میں ان کا کوئی مدمقابل تھا ہی نہیں۔ اور تقریباً بیس ہزار احادیث انہیں زبانی یاد تھیں۔

وفات

تنوخی نے اپنی حیات کی ۶۴ منزلیں طے کرنے کے بعد سہ شنبہ ۲۳؍ ربیع الاول ۳۴۲ھ کو رخت سفر باندھا اور بصرہ ہی میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ انتقال کے دوسرے روز شارع مرید میں ایک خریدی ہوئی قبر میں دفن کئے گئے۔ صاحب حدائق الحنفیہ نے ان کی وفات کا مادہ تاریخ ''ماہ منور'' لکھا ہے۔ تنوخی کے پوتے نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

(ماخذ: تاریخ بغداد، وفیات الاعیان،
حدائق الحنفیہ، معجم الادباء جواہر المضیہ)

حسن بن عبداللہ سیرافی

۲۹۰ ------- ۳۶۸ ھ

حسن نام اور ابوسعید کنیت تھی اور والد کا نام عبداللہ بن مرزبان تھا، جو مجوسی الاصل تھے لیکن اپنی زندگی کے آخری دنوں میں مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ پہلے ان کا نام بہزاد تھا جو بعد میں بدل کر عبداللہ ہو گیا۔ اسی نام سے انہوں نے شہرت بھی پائی

حسن کا اصلی وطن شہر سیراف تھا جو ملک فارس میں ساحل سمندر پر واقع تھا لیکن امتداد زمانہ نے اس مشہور و معروف شہر کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیا۔ یاقوت حموی نے اس کے متعلق ان الفاظ میں رونا رویا ہے۔

سیراف بلد علی ساحل من ارض فارس رأیته انا وبه اثر عمارة قدیمة و جامع حسن الا انه الآن الغالب علیه الخراب (سیراف ارض فارس کے بحری ساحل پر واقع ہے جس کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جہاں اب قدیم کھنڈرات کے صرف نشانات باقی ہیں۔ کسی زمانہ میں وہ نہایت ہی حسین شہر تھا۔ مگر اب ویران ہو گیا ہے)

حسن کی پیدائش ان کے وطن سیراف ہی میں ۲۹۰ ھ میں ہوئی اور وہیں انہوں نے ابتدائی تعلیم بھی حاصل کی۔ قرآن پاک ابوبکر بن مجاہد سے پڑھا۔ نحو ولغت اور حساب کی تعلیم کی تکمیل ابوبکر بن درید، ابوبکر بن سراج اور ابوبکر المبرمان سے کی۔ اس کے بعد ۳۲۰ ھ سے قبل سیراف کو خیر آباد کہہ دیا اور عمان کو اپنا مسکن بنایا اور یہیں علم فقہ کی تکمیل کی۔ ایک عرصہ تک عمان میں قیام کے بعد پھر اپنے وطن سیراف لوٹ آئے پھر یہاں سے عسکر گئے جہاں ان کی ملاقات محمد بن عمر صمیری سے ہوئی۔ صمیری کی مجلسوں میں شریک رہتے اور جملہ شرکاء مجلس کے مقابلہ میں استاذ کی نگاہ میں عزت و

احترام کی نظر سے دیکھے جاتے۔ قرینہ اغلب ہے کہ انہوں نے علم کلام کی تکمیل صمیری سے ہی کی ہو۔ عسکر میں ایک عرصہ تک قیام کرنے کے بعد بغداد آ گئے جہاں محمد بن الاذہر یوشجی، ابو عبید حربویہ اور عبد اللہ بن محمد بن زیاد نیشاپوری سے حدیث کی سماعت فرمائی۔ اس طرح تمام علوم وفنون کے بعد بغداد ہی میں عہدۂ قضاء پر فائز ہوئے اور تقریباً پچاس سال تک حضرت امام ابو حنیفہ کے مسلک کے مطابق مقدمات کے فیصلے اور جامعہ رضافہ میں فتاوے صادر فرماتے رہے۔ ساتھ ساتھ بغداد ہی میں قرآن، نحو، لغت، فقہ، فرائض، علم کلام، شعر عروض وقوافی اور حساب کا درس بھی دیتے رہے۔

علامہ سیرافی علماء بصرہ کے نزدیک علم نحو اور فقہ حنفی پر عبور رکھنے کی وجہ سے قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ زہد وورع کا یہ عالم تھا کہ نہ تو درس وتدریس کی اجرت لیتے اور نہ منصب قضاء کی تنخواہ اپنی ذات پر خرچ کرتے بلکہ پانے اخراجات کے لئے روزانہ درس وتدریس اور عدالت میں جانے سے قبل دس اوراق کی کتابت کرلیا کرتے تھے۔ بحیثیت مجموعی کتابت سے دس درہم روزانہ کی آمدنی ہوجایا کرتی تھی، جوان کی ضرورت کے لئے کافی تھا۔ عبادت وریاضت کا یہ حال تھا کہ دن کے باقی ماندہ اوقات تلاوت کلام پاک میں اور ساری رات نماز وغیرہ میں گزار دینا ان کا معمول تھا۔ چالیس سال تک انہوں نے متواتر اور مسلسل روزہ رکھنے کی محنت شاقہ بھی برداشت کی ہے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ سیرافی بہت زیادہ رقیق القلب ہو گئے۔ ان کے سامنے جب بھی موت، قبر، حشر ونشر، حساب، جنت ودوزخ، عذاب وثواب اور نیرنگی عالم کا تذکرہ ہوتا تو بے اختیار چیخ چیخ کر رونے لگتے۔ اور اس کا اثر ان پر ایک دن رات تو ضرور رہتا۔ جس کی بنیاد پر کھانے پینے اور دیگر معمولات میں بھی فرق آجاتا۔ چند اشعار حسرت وافسوس کے مضامین پر مشتمل پڑھا کرتے اور روتے رہتے یاقوت حموی نے لکھا ہے کہ ابو حیان نے سیرافی کو رورو کر یہ شعر پڑھتے ہوئے سنا۔

حنی الدھر من بعد استقامة ظھری وافضی الی تنغیص عیشه عمری

(زمانے نے اپنے قیام پذیر ہوجانے کی وجہ سے میری پیٹھ ٹیڑھی کر دی۔اور میری خوشگوار زندگی کو مکدر کر دیا۔)

سیرافی کے متعلق یہ کہاجاتا ہے کہ یہ معتزلی العقیدہ تھے لیکن اپنے عقائد کے اظہار میں اس قدر احتیاط برتتے کہ لوگوں کو صحیح طور پر ان کے عقائد کا علم نہ ہو سکا۔اس لئے ان کے عقائد کے متعلق جو کچھ بھی کہاجاتا ہے وہ محض قیاس پر مبنی ہے۔اس کے باوجود سیرافی اپنے ہم عصروں کے طعن وتشنیع سے محفوظ نہ رہ سکے اور ابو الفرخ اصفہانی صاحب کتاب الادغانی نے مندرجہ ذیل اشعار میں ان کی تضحیک و تذلیل کی ہے۔

لست صدرا ولا قرأت علی صد رولا علمک البکی بکاف

(نہ تو رئیس قوم ہے نہ تجھ میں اتنی صلاحیت ہے کہ صدر کے عہدہ پر فائز رہ سکے یا تجھے قوم سردار منتخب کرے اور نہ تیرا تھوڑا سا علم اس کام کے لئے کافی ہے)

لعن اللہ علی کل شعر و نحو وعروض یجیئ من سیراف

خدا کی لعنت ہو شعر و عروض پر جو سیراف کی جانب سے آیا ہو۔

سیرافی کی وفات دوشنبہ مورخہ ۲ رجب المرجب ۳۶۸ھ میں ظہر وعصر کے درمیان ہوئی۔بعد نماز عصر اسی روز خیزران کے قبرستان میں دفن ہوئے۔صاحب حدائق حنفیہ نے ان کی وفات کا مادہ تاریخ ''بندہ ایماندار'' لکھا ہے۔

سیرافی کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابوں نے شہرت حاصل کیں۔

کتاب شرح سیبویہ، کتاب الفات الوصل و القطع، کتا اخبار للغوئین، کتاب الوقف والابتداء، کتاب صنعة الشعر و البلاغة، کتاب شرح مقصورة بن درید—

ان کے علاوہ یاقوت حموی کے قول کے مطابق ایک کتاب، کتاب الاقناع فی النحو کے نام سے انہوں نے لکھنی شروع کی تھی لیکن ابھی یہ مکمل بھی نہ ہوئی تھی

کہ پیغام اجل آگیا۔ اس کتاب کو ان کے بعد ان کے لڑکے یوسف نے مکمل کیا۔

(ماخذ: تاریخ بغداد، مجمع الادباء، وفیات الاعیان،
جواهر المضنیه، فهرست ابن ندیم)

علی بن عیسیٰ رمانی

۲۹۶ ------- ۳۸۴ ھ

علی نام اور کنیت ابوالحسن تھی۔ واسط میں ایک قصر تھا جو رمان کے نام سے مشہور تھا۔ قرینہ اغلب ہے کہ اسی جانب انہیں منسوب کیا گیا اور عرف عام میں یہ رمانی کہے گئے۔ والد کا نام عیسیٰ بن علی بن عبداللہ تھا۔ بعض لوگ انہیں اخشیدی بھی کہتے ہیں جس کی وجہ یاقوت حموی نے یہ بیان کی ہے کہ یا تو یہ علم کلام میں ابن اخشید کے شاگرد تھے یا ان کے عقائد کے پیرو تھے۔

رمانی کی ولادت ابن خلکان اور خطیب بغدادی کی تحریر کے مطابق ۲۹۶ھ میں ہوئی لیکن یاقوت حموی نے تاریخ پیدائش ۲۷۶ھ بتائی ہے۔

رمانی نے مختلف علوم وفنون کی تکمیل ابوبکر بن درید، ابوبکر سراج اور زجاج سے کی۔ نحو، لغت، نجوم، علم کلام اور فقہ میں خاصی شہرت حاصل کی۔ خصوصیت کے ساتھ نحو میں انہوں نے جو کمال حاصل کیا یہ ان کے لئے ان کے ہم عصروں میں باعث امتیاز ثابت ہوا، لیکن دقت پسندی ان کا شیوہ تھا اسی وجہ سے ان کی تحریر کا سمجھنا اور ان

کے بیان سے کماحقہ فائدہ اٹھانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں تھی۔ چنانچہ اسی بناء پر یہ بدنام بھی ہوئے۔ پھر بھی نحویوں کے قول کے مطابق اس زمانہ میں صرف تین نحوی تھے جس کو یاقوت حموی نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ان کی دقت پسندی بھی پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔

وکان یقال النحویون فی زماننا ثلاثة واحد لا یفهم کلامه وهو الرمانی و واحد یفهم بعض کلامه وهو ابو علی الفارسی وواحدهم یفهم جمیع کلامه بلا استاذ وهو السیرافی. (اور ہمارے زمانے کے نحویوں کا قول ہے کہ تین اشخاص ایسے ہیں کہ جو حسب ذیل اوصاف کے مالک ہیں۔ ایک وہ جن کا کلام سمجھ میں نہیں آتا ہے وہ رمانی ہیں اور ایک وہ جن کے کلام کا کچھ حصہ سمجھ میں آتا ہے وہ ابو علی فارسی ہیں۔ اور جن کا پورا پورا کلام بغیر استاد کے سمجھ میں آتا ہے وہ سیرافی ہیں)

عموماً رمانی کا کلام ناقابل فہم اس لئے ہو جاتا تھا کہ وہ نحو میں منطق کی آمیزش کر دیا کرتے تھے اسی بناء پر ابو علی فارسی کا قول ہے۔

ان کان النحو مایقو له الرمانی فلیس معنامنه شیء و ان کان النحو مانقوله نحن فلیس معه منه شیء (اگر نحو وہی ہے جس کو رمانی کہتے ہیں تو پھر ہمارے پاس اس کا کچھ بھی نہیں ہے۔ اور اگر نحو وہ ہے جو ہم کہتے ہیں تو پھر رمانی کے پاس کچھ نہیں یعنی یا تو ہم نحوی ہیں یا رمانی)

رمانی نے درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری کر رکھا تھا۔ نحو میں انہیں کمال حاصل تھا اس لئے ان کے حلقہ درس میں زیادہ تر نحوی نکات ہی زیر بحث آتے لیکن جیسا کہ میں نے اگلی سطروں میں لکھا ہے کہ رمانی اپنی دقت پسندی کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوئے۔ اسی بناء پر ان کے اکثر تلامذہ نے مسائل نحویہ میں خاطر خواہ فائدہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کے حلقہ درس سے کنارہ کش ہو کر دوسرے نحوی حضرات کی

مجلسوں میں شریک ہوکر اپنی علمی صلاحیت کو پروان چڑھایا۔ یاقوت حموی نے مرو کے ایک شخص کا تذکرہ اس ضمن میں کیا ہے جس نے چند نحوی اصول معلوم کرنا چاہا لیکن رمانی کے جوابوں سے وہ مطمئن نہیں ہو سکا۔ اس شخص نے رمانی کو دوبارہ سمجھانے کی درخواست کی تو رمانی غصے میں آ گئے۔ بالآخر وہ شخص ان کے یہاں سے واپس ہو کر ابو الحسن دقائق کے حلقہ درس میں شریک ہو گیا۔

رمانی نحو کے علاوہ حدیث کا بھی درس دیا کرتے تھے۔ ان سے ابوالقاسم تنوخی، ابومحمد جوہری اور بلال ابن محسن کاتب نے احادیث کی روایتیں کی ہیں

رمانی عقیدتاً معتزلی تھے لیکن معتزلہ میں بھی ایسے فرقہ سے تعلق رکھتے تھے جس کے نزدیک نبی کریم ﷺ کے بعد تمام انسانوں میں حضرت علیؓ افضل و برتر تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس فرقہ کو تفضیلیہ یا رافضی کہہ سکتے ہیں۔

رمانی کی وفات قادر باللہ کے عہد میں شب یکشنبہ مورخہ ۱۱ر جمادی الاول ۳۸۴ھ میں ہوئی۔

رمانی نہ صرف یہ کہ متکلم یا معتزلی تھے بلکہ ایک عالم متبحر اور باکمال ادیب ہونے کے ساتھ صاحب طرز نحوی، لغوی، نجومی، مفسر اور فقیہ بھی تھے۔ چنانچہ ان تمام علوم وفنون پر مشتمل انہوں نے اپنی بیش بہا تصانیف چھوڑیں جو حسب ذیل ہیں:

کتاب تفسیر القرآن، کتاب الحدود الاکبر، کتاب الحدود الاصغر، کتاب معانی الحروف، کتاب شرح الصفات، کتاب شرح الموجز لابن السراج، کتاب شرح الالف و اللام للمازنی، کتاب شرح مختصر الحرمی، کتاب اعجاز القرآن، کتاب شرح اصول ابن سراج، کتاب شرح سیبویه، کتاب المسائل المفردات من کتاب سیبویه، کتاب شرح المدخل للمبرد، کتاب التصریف، کتاب الهجاء، کتاب الایجاز فی النحو، کتاب اشتقاق الکبیر، کتاب اشتقاق

الصغير، كتاب الغات فی القرآن، كتاب شرح المقتضب، كتاب شرح معانی الزجاج.

(ماخذ: وفیات الاعیان، تاریخ بغداد، معجم الادباء)

جعل الکاغذی

۳۰۸ -------- ۳۹۹ ھ

ابوعبداللہ حسین بن علی بن ابراہیم المعروف بہ جعل الکاغذی کی ولادت ۳۰۸ھ میں بصرہ میں ہوئی۔ علوم دینیہ اور علم کلام کی تکمیل مشاہیر متکلمین اور علماء اسلام مثلاً ابو القاسم ابن سہویہ، ابوالحسن کرخی، ابوجعفر صمیری، ابوعلی بن خلاد اور ابو ہاشم عبد السلام بن محمد جبائی وغیرہم کے ذریعہ ہوئی۔

علم فقہ میں ید طولیٰ اور علم کلام پر مہارت حاصل تھی۔ فقہی مسائل میں علماء اہل عراق کے مسلک کے مطابق فتاوے صادر فرماتے یعنی امام اعظم ابوحنیفہؒ کے متبع تھے۔ علم وفضل کے اعتبار سے ان کا مقام بہت بلند تھا اور خراسان وغیرہ میں بھی علمی وادبی مسائل میں ان کا نام بطور سند لیا جاتا تھا۔

کاغذی کا انتقال مدینۃ السلام بغداد میں ۳۹۹ھ میں ہوا۔ علم کلام اور علم فقہ دونوں ہی فنون میں ان کی مختلف ومتعدد تصنیفات کا تذکرہ ملتا ہے۔ چنانچہ علم کلام میں مندرجہ ذیل کتابوں کے اسماء آتے ہیں۔

کتاب نقض کلام الراوندی فی ان الجسم لایجوزان یکون محترما لا من شیء و نقضه لنقض الرازی لکلام البلخی علی الرازی

کتاب نقض کتاب الرازی فی انه لایجوز ان یفعل الله تعالیٰ بعد ان کان غیر فاعل کتاب الجواب ان مسئلتی الشیخ ابو محمد ن لرامهرمزی. کتاب الکلام فی ان الله تعالیٰ لم یزل موجودا ولا شیء سواه الی عن. کتاب خلق الخلق. کتاب الایمان. کتاب الاقرار. کتاب المعرفة.

فقہ میں کاغذی کی درج ذیل کتابیں ہیں:

کتاب شرح مختصر ابی الحسن الکرخی. کتاب الاشربه وتحلیل نبیذ التمر. کتاب تحریم المتعة. کتاب جواز الصلوٰة (فارسی)

(ماخذ: جملہ حالات ماخوذ از فہرست ابن ندیم)

قاضی ابوبکر محمد بن طیب باقلانی

المتوفی ۴۰۳ھ

قاضی ابوبکر محمد بن طیب بن محمد بن جعفر بن قاسم۔ بصری الاصل تھے۔ عرف عام میں باقلانی کہے جاتے تھے۔ انہوں نے علم حدیث کی تکمیل بغداد ہی میں کی اور محدثین میں سے ابوبکر بن قطیعی، ابومحمد بن ماسی، ابواحمد حسین بن علی نیشاپوری سے انہوں نے روایتیں کی ہیں۔

باقلانی کے تلامذہ میں محمد بن ابی الفوارس، قاضی ابوجعفر محمد بن احمد سمنانی کے اسماء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

باقلانی کی علمی اور ادبی صلاحیت بہت ٹھوس تھی۔ یہ جودت طبع اور برجستگی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ زور بیان اور وسعت کلام کے اعتبار سے بھی یہ اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ راویان حدیث کے درمیان ثقہ اور متکلم کی حیثیت سے ایک دنیا ان کی برتری پر مہر تصدیق ثبت کر چکی ہے۔

مناظرے کی مجالس میں بھی ایک مناظر کی حیثیت سے شرکت کیا کرتے تھے چنانچہ ابن خلکان نے بیان کیا ہے کہ ابوسعید ہارونی اور ان کے درمیانی مناظرے ہوتے تھے جس میں دونوں ہی ایک دوسرے پر چوٹیں کیا کرتے تھے۔ باقلانی کی برجستگی کا یہ عالم تھا کہ مناظرہ کی مجلسوں میں بھی برجستہ جواب دینے سے نہیں چوکتے تھے۔

چنانچہ ایک مرتبہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک خاص مجلس مناظرہ میں مناظر کی حیثیت سے پہنچے جہاں ان کے فریق مخالف ابن معلم قبل سے ہی موجود تھے۔ باقلانی کو آتا دیکھ کر انہوں نے اپنے ساتھیوں کی جانب متوجہ ہو کر کہا ''تمہارے نزدیک شیطان آ گیا ہے'' قاضی ابوبکر باقلانی نے بھی یہ بات سن لی۔ ابن معلم سے کچھ دور تھے اس لئے خاموش رہے جب ان کے نزدیک آ کر بیٹھ گئے تو انہوں نے کہا کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ انا ارسلنا الشیاطین الکافرین تؤزھم ازا (ہم نے شیاطین کو کافروں کے پاس اس لئے بھیجا ہے کہ وہ ان کے کفر کی کمی پوری کر دے۔) یعنی اگر میں شیطان ہوں تو تم کافر ہو اور تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں کہ تم کو کفر کی انتہاء کو پہنچا دوں۔

باقلانی عقیدتاً اشعری المذہب تھے اور امام ابوالحسن اشعری کے عقائد کے پوری طرح متبع تھے۔ زہد و ورع کا یہ عالم تھا کہ عشاء کی نماز کے بعد اسی رکعات

نفل نمازوں کے پڑھنے کا معمول تھا۔ اور یہ عمل سفر وحضر دونوں میں برقرار رہتا تھا۔ لیکن اگر کسی روز یہ عمل نہیں ہو پاتا تو اس کے بدلہ ۳۵ اوراق اپنے حافظہ پر زور ڈال کر کچھ نہ کچھ لکھ لیا کرتے تھے۔ اور صبح کی نماز کے بعد رات کے لکھے ہوئے اوراق اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو پڑھنے کے لئے دے دیتے۔ وہ ساتھی اسے بلند آواز میں پڑھتا اور باقلانی اس میں مناسب ترمیم کرتے جاتے تھے۔ اس طرح اس پر نظر ثانی بھی ہو جاتی اور اسے کتاب کی شکل دے دی جاتی۔

باقلانی کی فصاحت و بلاغت اور حافظہ کا چار دانگ عالم میں شہرہ تھا چنانچہ ان کی فصاحت کے متعلق ابو محمد باقی کہا کرتے تھے "لو اوصی رجل بثلث ماله ان یدفع الی افصح الناس لوجب ان یدفع لابی بکر الا شعری" (اگر کوئی شخص یہ وصیت کرے کہ اس کا تہائی مال لوگوں میں سب سے زیادہ فصیح شخص کو دیا جائے تو یقیناً وہ مال ابو بکر اشعری کو ہی دیا جائے گا)

باقلانی کی قوت حافظہ کا اعتراف ابو بکر خوارزمی ان الفاظ میں کرتے ہیں "کل مصنف ببغداد انما ینقل من کتب الناس الی تصانیفه سوی القاضی ابی بکر فان صدره یحوی علمه و علم الناس" (بغداد کے تمام مصنفین اپنی تصانیف میں دوسری کتابوں سے مدد لیتے ہیں سوائے قاضی ابو بکر کے کہ ان کا سینہ ان کے اور لوگوں کے علم سے معمور ہے)

شعراء نے بھی اپنے اشعار میں ان کی علمی و ادبی صلاحیت کو سراہا ہے اور ان کے کمال کا اعتراف قصائد کی شکل میں کیا ہے۔ چنانچہ ابو الحسن علی بن عیسیٰ شکری نے ایک قصیدہ باقلانی کی مدح میں لکھا ہے جو اگرچہ بہت طویل ہے لیکن اس کے چند اشعار جن میں خاص طور سے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے تعریف و توصیف کی ہے درج ذیل ہے۔

ملکت محبات القلوب ببهجة　　مخلوقة من عفة و تحبب

(تو خوشی سے لوگوں کی محبوب چیزوں کا مالک ہوگیا ہے۔ یہ محض تیری پاکبازی اور محبت کی وجہ سے ہے)

فکانها من حیث ماقابلتها شیم الامام محمد بن طیب

(گویا وہ اس طرح ہوگیا ہے کہ اگر اس کی مد مقابل کوئی چیز ہے تو وہ امام محمد بن طیب کا پسندیدہ اخلاق ہے)

الیعربی فصاحة و بلاغة والا شعری اذا اعتزی للمذهب

([باقلانی] فصاحت و بلاغت میں یعربی کے مد مقابل ہیں اور مذہب کے اعتبار سے اشعری ہیں)

قاضی اذا التبس القضاء علی الحی کشفت له الآراء کل معنب

(اور وہ قاضی ہے جب کہ دلائل پر فیصلہ مشتبہ ہو جائے تو تمام باریکیاں اور لاینحل مسائل اس کے ناخن تدبیر سے حل ہو جاتے ہیں)

قاضی ابوبکر باقلانی کی وفات روز شنبہ ۲۳ رذی قعدہ ۴۰۳ھ میں ہوئی۔ ان کے جنازہ کی نماز ان کے فرزند حسن نے پڑھائی اور انہیں پہلے ان ہی کے مکان میں درب مجوس میں دفن کیا گیا پھر باب حرب کے قبرستان میں منتقل کر دیا گیا۔

ایک شاعر نے ان کا مرثیہ بھی لکھا ہے جس کے دو اشعار خطیب بغدادی اور ابن خلکان نے اپنی اپنی کتابوں میں درج کیے ہیں، جو درج ذیل ہیں

انظر الی جبل تمشی الرجال به
و انظر الی القبر ما یحوی من السلف

(پہاڑ کو دیکھو جس پر لوگ چلتے ہیں اور اس قبر کو دیکھو جس میں ایسا شخص مدفون ہے جس کے مثل دنیا میں پھر کوئی پیدا نہ ہوگا)

انظر الی صارم الاسلام متغمدا
وانظر الی درة الاسلام فی الصدف

(دور اسلام کی اس تلوار کی طرف دیکھو جو میان میں ہے۔ اور اسلام کے اس آبدار موتی کو دیکھو جو سیپ میں چھپا ہوا ہے)

باقلانی کی تصنیف کے متعلق خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بہت سی تصنیف کردہ کتابیں چھوڑیں جو مخالفین مثلاً روافض، معتزلہ، جہمیہ اور خوارج کے رد میں تھیں لیکن ان کے متعلق مزید معلومات فراہم نہ ہو سکیں۔ عبد القاہر بغدادی نے ان کی دو کتابوں کا تذکرہ ضمناً اپنی کتابوں میں کیا ہے جو درج ذیل ہیں:

(۱) کتاب کبیر (۲) کتاب اکفار متاولین

(یہ دونوں کتابیں نظام کی ضلالت و گمراہی کے متعلق ہیں)

(ماخذ: وفیات الاعیان، تاریخ بغداد، الفرق بین الفرق)

محمد بن حسن المعروف با بن فورک

المتوفی ۴۰۶ھ

ابوبکر بن محمد بن حسین بن فورک کا وطن اصلی اصفہان تھا، لیکن انہوں نے عراق میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ ایک عرصہ تک وہیں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا پھر ''رے'' چلے آئے۔ لیکن یہاں زیادہ روز قیام نہ کر سکے اور اہل نیشاپور کے بار بار اصرار کرنے پر نیشاپور چلے آئے اور یہاں ایک مدرسہ قائم کیا جس میں مختلف علوم و فنون کے احیاء کا کام کرتے رہے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر کے اپنے فیوض و

برکات سے عوام الناس کو عموماً اور اہل نیشاپور کو خصوصاً مستفیض فرماتے رہے۔اس درمیان تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ جب ان کی تصنیفات کی تعداد ایک سو تک پہنچ گئی اور ان کے عقیدت مندوں کی تعداد بھی دن بدن بڑھتی گئی تو شہر غزنہ کے علماء پر یہ بات گراں گزری اور ان علماء نے ابن فورک کو مناظرے میں شرکت کرنے پر مجبور کیا۔ یہ علمی اور دینی حیثیت سے صلاحیت میں کسی سے کم تو تھے نہیں اس لئے بلا چوں وچرا اس چیلنج کو انہوں نے قبول کرلیا۔اور شہر غزنہ آکر مناظرہ میں شریک ہوئے۔ اپنے دلائل و براہین کی مدد سے ابوعبداللہ بن کرام کے اصحاب کے عقائد کی خوب دھجیاں اڑائیں اور ان تمام علماء کو غلط ٹھہرایا۔ مناظرے کے اختتام کے بعد جب یہ اپنے شہر واپس آرہے تھے تو دشمنوں نے موقع پاکر کسی طرح کھانے میں زہر دے دیا جس کے اثر سے وہ جاں بر نہ ہو سکے۔اسی حال میں ابوعلی دقائق ان کے پاس عیادت کی غرض سے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ابن فورک اشکبار ہیں۔ دقائق نے تسلی دی اور کہا کہ ''اللہ آپ کو شفا بخشے گا اور آپ کی مصیبتیں دور فرمائے گا، اس لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے'' ابن فورک نے کہا کہ ''تم سمجھتے ہو کہ میں موت سے ڈر رہا ہوں حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ موت کے بعد جو کچھ پیش آنے والا ہے اس سے البتہ خائف ہوں''۔

جیسا کہ میں نے گزشتہ سطروں میں تحریر کیا ابن فورک کی وفات شہر غزنہ اور نیشاپور کے درمیان کھانے میں زہر دینے سے ہوئی۔ ابن خلکان نے ان کی رحلت کا سال ۴۰۶ھ لکھا ہے۔ان کو نیشاپور کے محلہ خیرہ میں سپرد خاک کیا گیا۔

ان کی تصنیفات کی تعداد ایک سو سے متجاوز ہے لیکن صرف ایک کتاب مشکل الحدیث نام کی راقم کو دستیاب ہوسکی، جس کا مختصر تعارف درج ذیل ہے۔

مشکل الحدیث: قلمی نسخہ مملوکہ خدابخش لائبریری پٹنہ ۱۲۸ عربی بخط نسخ سن کتابت ۶۰۷ ماہ جمادی الاول۔ تعداد اوراق ۸۲۔ ہر صفحہ پر اوسطاً ۲۷ سطریں ہیں۔

اس کتاب میں عقائد سے متعلق معتزلین اور مشبہین نے حوالہ میں جو احادیث پیش کی ہیں ان کو جمع کر کے ہر ایک حدیث کے بعد اس کی تشریح اپنے مسلک کے مطابق کی ہے نیز اسی ضمن میں معتزلین اور اہل بدعت جس طرح اس حدیث کو اپنی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں اس کی تردید کرتے ہوئے حقیقی معنی کی وضاحت قرآن و حدیث کی روشنی میں کی ہے۔ کتاب کی ابتدا حمد و نعت سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد چند صفحات پر مشتمل کتاب کا مقدمہ ہے جس میں کتاب کی وجہ تالیف اور غرض و غایت بیان کی ہے۔ نیز انداز تالیف کی بھی وضاحت کی ہے۔ مقدمہ کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں۔

امابعد فقد وقفت اسعدکم الله بمطلوبکم (امابعد اللہ تمہیں نیک بخت بنائے میں تمہارے مقصد سے واقف ہو گیا) اس کے بعد موضوع، غرض و غایت کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔

الی املاء کتاب یذکر فیه ما اشتبه من الاحادیث المرویة عن رسول مما بوهم ظاهره التشبیه---وذکرتم ان اهل البدع نحو الجهمیة و المعتزلة و الرافضة و الجسمیة و من ناصب هذه الفرقة بالعداوة من سائر اهل الهواء الباطلة (اس کتاب میں نبی ﷺ سے روایت کردہ ان احادیث کو جمع کیا گیا ہے جن میں اشتباہ ہے اور جن کے متعلق تشبیہ کا گمان یا خیال کیا جاتا ہے---اور تم لوگوں نے اہل بدعت جیسے جہمیہ، معتزلہ، روافض اور جسمیہ کا تذکرہ کیا ہے جو اس فرقہ کو اپنی عداوت اور تمام فاسد خیالات کی بناء پر نقصان پہنچانے والے ہیں۔

مقدمہ کتاب کے بعد کتاب کی ابتداء پہلی فصل سے ہوتی ہے اس طرح پوری کتاب متعدد فصول پر مشتمل ہے۔ ہر فصل مستقلاً بحیثیت ایک باب کے ہے۔ جس کے تحت احادیث مرویہ کو کسی ایک مسئلہ سے متعلق نقل کر کے اس کی مناسب اور موزوں تشریح و توضیح کی گئی ہے۔

(ماخذ: کل حالات ماخوذ از وفیات الاعیان)

قاضی عبدالجبار معتزلی

المتوفی ۴۱۵ھ

قاضی ابوالحسن عبدالجبار ابن احمد بن عبدالجبار اسد آباد کے رہنے والے تھے۔ان کا کمال علم وادب درج ذیل باکمال اساتذہ کا رہین منت ہے۔

علی بن ابراہیم سلمہ قزوینی، عبداللہ بن جعفر بن احمد اصبہانی، قاسم بن ابی صالح ہمدانی، عبدالرحمن بن حمدان الجلاب، زبیر بن عبدالواحد اسد آبادی، محمد بن احمد بن عمرو الزئبقی بصری، محمد بن عبداللہ بن اخی الساوی اور محمد بن عبداللہ رامہرمزی۔

قاضی عبدالجبار ''رے'' کے قاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز تھے۔فتاویٰ مسلک شوافع کے مطابق صادر فرماتے اور خود بھی فروعی مسائل میں شافعی المسلک تھے لیکن عقائد اور اصول عقائد کے اعتبار سے معتزلین کے گروہ میں شامل تھے۔اس لئے ان کے نام کے ساتھ مورخین نے ''معتزلی'' کا اضافہ کیا ہے۔

قاضی عبدالجبار سفر حج کے لئے جاتے ہوئے بغداد میں قیام فرما ہوئے تھے اور اس قیام کے دوران انہوں نے احادیث کے درس کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا چنانچہ بغداد میں قاضی ابوعبداللہ صمیری تنوخی اور قاضی صمیری نے ان سے احادیث کی روایتیں کی ہیں جنہیں بالا سناد خطیب بغدادی نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔

سفر حج سے واپسی کے دوران ''رے'' میں داخل ہونے سے قبل ہی ۴۱۵ھ میں خراسان میں جان جاں آفریں کے حوالہ کر دی۔

خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ معتزلین کے مسلک اور اصول کی وضاحت میں انہوں نے مختلف کتابیں بطور یادگار چھوڑیں۔لیکن امتداد زمانہ نے محقق کی رسائی ان کتابوں تک نہ ہونے دی۔صرف ایک کتاب المغنی فی الامامۃ کا تذکرہ نظروں سے گزرا ہے۔

(ماخذ: کل حالات ماخوذ از تاریخ بغداد جلد ۱۱ و تاریخ ادبیات ایران جلد ۲)

ابواسحاق اسفرائینی

المتوفی ۴۱۸ھ

استاذ ابواسحاق ابراہیم بن محمد بن ابراہیم بن مہران کا وطن اسفرائن تھا۔ ان کا لقب رکن الدین تھا۔ اور وطن کی نسبت سے اسفرائینی سے زیادہ مشہور ہوئے۔

اسفرائینی نے ابتدائی تعلیم کی تکمیل اپنے وطن اسفرائین میں کی اور اس کے بعد طلب علم کے شوق میں عراق اور خراسان وغیرہ کا سفر کیا۔ چنانچہ خراسان میں ابوبکر اسماعیل اور عراق میں ابوبکر محمد بن عبداللہ شافعی اور دعلج بن احمد سے علوم دینیہ کی تکمیل کی جس میں روایت حدیث بھی شامل ہے۔ اس کے بعد اپنے وطن واپس آئے اور ایک مدت تک یہیں مقیم رہے پھر نیشاپور تشریف لے گئے جہاں انہوں نے ایک مدرسہ قائم کیا جس کی ظاہری و باطنی چمک دمک، حسن اور خوبصورتی نیز مجلس درس کا اہتمام اور نظم وضبط نے تمام اگلی وپچھلی درسگاہوں کی روشنیوں کو ماند کر دیا اور بے اختیار لوگ یہ پکار اٹھے کہ اس سے قبل اس قسم کی کوئی درسگاہ نیشاپور میں تھی ہی نہیں۔ اسفرائینی اس مدرسہ میں خود بھی درس دیتے تھے، جس میں مندرجہ ذیل حضرات خصوصیت سے شامل ہوتے تھے۔ ابوبکر بیہقی ، ابو القاسم قشیری، ابو السائب، ہبۃ اللہ ابن ابی الصہبا، محمد بن ابو الحسن بالوی اور قاضی ابو الطیب بصری۔

اسفرائینی کا شمار ائمہ مجتہدین اور ثقہ راویوں میں ہوتا تھا۔ ان کی علمی شخصیت بھی بڑی قابل قدر تھی۔ علم کلام کے اصول وفروع پر گہری نظر تھی۔ مختلف علوم و فنون کے جامع تصور کئے جاتے تھے۔ مورخین اور علماء کے نزدیک اسفرائینی ابن فورک اور باقلانی کے ہم پلہ تھے۔ چنانچہ اصحاب ابوالحسن اشعری کا یہ قول اس بارے

میں بہت مشہور ہے: ابن الباقلانی بحر مغرق و ابن فورک قلب صل مطرق و الا سفرائینی نار محرق (ابن الباقلانی ایک گہرے سمندر ہیں، ابن فورک بارش کے پانی کے جوہر ہیں اور اسفرائینی جلا دینے والی آگ ہیں۔

اسفرائینی اپنی آخری عمر میں اسفرائین سے واپس نیشاپور آئے تو انہوں نے اپنے رفقاء اور شاگردوں کے سامنے اپنی آخری خواہش کا اظہار کیا کہ ''کاش میں نیشاپور میں ہی داعی اجل کو لبیک کہتا تا کہ تمام اہل نیشاپور میرے جنازہ میں شریک ہوتے''

چنانچہ نیشاپور سے ان کی اس قلبی الفت اور لگاؤ کا یہ اثر ہوا کہ پانچ ہی مہینہ کے بعد ان کا انتقال نیشاپور میں یوم عاشورہ ۴۱۸ھ میں ہوا۔ لیکن ان کی نعش کو اسفرائین لے جا کر ان کے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

اسفرائینی کی تصنیفات میں سے مندرجہ ذیل کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے۔

کتاب الجامع فی اصول الدین و الرد علی الملحدین (پانچ جلدوں میں) مسائل الدورا اور تعلیقة فی اصول الفقه.

(ماخذ: کل حالات ماخوذ از
طبقات الشافعية الكبرى، وفيات الاعيان)

محمد بن علی بن طیب بصری

المتوفی ۴۳۶ھ

ابوالحسن محمد بن علی بن طیب بصرہ کے رہنے والے تھے لیکن مستقل سکونت

انہوں نے بغداد ہی میں اختیار کر لی تھی اور یہیں ان کو متکلم کی حیثیت سے شہرت بھی حاصل ہوئی۔ محمد بصری نے صرف ایک حدیث روایت کی ہے جس کی قرأت ہلال بن محمد نے کی تھی اور یہ سامع کی حیثیت سے درس میں شریک تھے۔ اگر چہ سماعت حدیث ظاہر بن لبنوۃ وغیرہ سے بھی ثابت ہے، لیکن اسے تقویٰ و پرہیزگاری کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ ہی سمجھا جائے گا کہ انہوں نے سوائے ہلال بن محمد سے سنی ہوئی حدیث کے کسی دوسری حدیث کی روایت نہیں کی ہے۔ اس حدیث کی روایت ان سے عبداللہ بن عدی جرجانی نے کی ہے۔ حدیث یہ ہے

عن ابی مسعودؓ البدری قال قال رسول اللہ ﷺ ان مما ادرک الناس من کلام النبوۃ الا ولی اذالم تسمع فاصنع ماشئت (ابو مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو بات نبوت سے متعلق لوگوں کو معلوم ہوگئی ہے وہ بہتر ہے اور اگر معلوم نہ ہوسکی تو اس میں وسعت ہے یعنی اس بات کی گنجائش ہے کہ جیسا مناسب سمجھے کرے)

علم کلام میں محمد بصری کا پایہ بہت بلند تھا اور معتزلہ کے امام سمجھے جاتے تھے۔ طرز سخن انوکھا اور انداز تحریر نرالا تھا۔ جو بات بیان کرتے یا لکھتے تو وہ ٹھوس دلیل کے ساتھ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنے زمانے کے علماء میں ممتاز اور افضل تھے۔

مذاہب معتزلہ کی توضیح وتشریح کے سلسلہ میں انہوں نے اپنی گراں قدر اور بیش بہا تصنیفات چھوڑی، جن سے معتزلین نے کافی استفادہ کیا اور اس طرح محمد بصری کو شہرت دوام حاصل ہوئی۔

ان کی وفات سہ شنبہ مورخہ ۵/ ربیع الاول ۴۳۶ھ میں بغداد میں ہوئی۔ نماز جنازہ قاضی ابوعبداللہ صمیری نے پڑھائی اور شونیزی کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

ان کی تصنیفات کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل کتابوں کا نام آتا ہے۔

(۱) کتاب الکبیر: یہ کتاب اصول فقہ میں ہے۔ اس کتاب کو ماخذ مان کر امام فخرالدین رازی نے کتاب المحصول تالیف کی۔

(۲) کتاب تصفح الادلة : یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔

(۳) کتاب غرر الادلة : یہ کتاب گرچہ ایک ہی جلد میں ہے لیکن بہت ضخیم ہے

(۴) شرح الاصول الخمسہ

(۵) کتاب فی الامامة : (یہ تمام کتابیں اصول لدین کی تشریح میں ہیں)

(ماخذ: تاریخ بغداد جلد ۳، وفیات الاعیان جلد اول)

محمد بن عمر محامی

۳۵۹ھ ۴۳۸ھ

نام محمد کنت ابو بشیر۔ والد کا نام عمر اوران کی کنیت ابو السکر ی تھی۔ عمر کے والد کا نام محمد بن ابراہیم بن غیاث تھا۔ یہ لوگ سر من رائی کے رہنے والے تھے۔ یہیں محمد محامی کی ولادت شب جمعہ ۱۰ رمحرم الحرام ۳۵۹ھ کو ہوئی۔ انہوں نے ابوالحسن لؤلؤ، محمد بن مظفر، ابوعبداللہ مرزمانی اور ابن شاہین سے احادیث کی سماعت فرمانے کے بعد مستقل طور پر نہر نزارین میں سکونت اختیار کی اور ایک عرصہ تک قضاۃ کے سامنے وکیل کی حیثیت سے پیش ہو کر خلق خدا کی خدمت کرتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ کہہ دینا بھی برمحل ہوگا کہ محامی آج کل کے وکلاء کے مانند کذب بیانی، افتراء پردازی اور بہتان تراشی کے امام نہ تھے۔ بلکہ ان کا شمار احادیث کے ثقہ راویوں میں ہوتا ہے۔ ان سے خطیب بغدادی نے احادیث کی کتابت کی ہے۔ اوران کی صحیح سماعت اور روایت کی توثیق وتصدیق بھی کی ہے۔

محامی عقیدتاً اعتزال کی جانب مائل تھے اور اپنے عقیدے کا اظہار بھی علی الاعلان کیا کرتے تھے۔

محامی نے دوشنبہ مورخہ ۲۸ رجمادی الاول ۴۳۸ھ کو وفات پائی۔ ان کی

نعش کو باب شام کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

(ماخذ: کل حالات ماخوذ از تاریخ بغداد جلد ۳)

علامہ ابن حزم ظاہری

۳۸۴ھ ۴۵۶ھ

علامہ ابن حزم کا سلسلہ نسب اس طرح ہے۔

''ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم بن غالب بن صالح بن خلف بن معدان بن سفیان بن یزید''

ان کے اجداد میں سب سے پہلے یزید مسلمان ہوئے جو سرزمین فارس سے متعلق تھے۔ ان کے دادا سعید بن حزم خاندان کے سب سے پہلے شخص تھے جن کی ولادت اندلس کے ایک گاؤں اونیہ میں ہوئی، جو بعد میں منتقل ہو کر قرطبہ آ گئے تھے۔ اور وزارت کے عہدہ پر اپنی آخری عمر تک فائز رہے۔

علامہ ابن حزم کی ولادت اندلس کے معروف و مشہور شہر قرطبہ میں چہار شنبہ مورخہ ۳۰ / رمضان ۳۸۴ھ کو طلوع آفتاب کے بعد ہوئی۔

علامہ ابن حزم کی ابتدائی دینی تعلیم بڑے وسیع پیمانے پر ہوئی لیکن فقہ کی تحصیل میں رغبت کی وجہ یاقوت حموی نے یہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ علامہ ابن حزم ایک شخص کے جنازہ میں شرکت کی غرض سے مسجد میں عصر کی نماز سے قبل بغیر دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کئے ہوئے ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔ اس پر ان کے سرپرست و مربی نے انہیں تحیۃ المسجد پڑھنے کو کہا تو وہ سمجھ نہ سکے چنانچہ بعض حاضرین نے ان سے کہا کہ تمہاری

اتنی عمر ہوگئی لیکن تم یہ بھی نہیں جانتے کہ تحیۃ المسجد واجب ہے۔ (اس وقت علامہ کی عمر ۱۶ برس تھی) بالآخر یہ کھڑے ہوگئے اور دورکعت نماز ادا کی۔ پھر جب نماز جنازہ سے فراغت ہوگئی اور یہ میت کے قرابت مندوں اور دوستوں کے ساتھ دوبارہ مسجد میں داخل ہوئے تو دورکعت تحیۃ المسجد کی نیت باندھ کر کھڑے ہوگئے حالانکہ وہ وقت نماز عصر کے بعد کا تھا اس لئے مکروہ تھا۔ لوگوں نے بیٹھ جانے کو کہا اور یہ بتایا کہ یہ نماز کا وقت نہیں ہے۔ اس واقعہ سے انہیں جو شرمندگی وندامت ہوئی یہی اس بات کی محرک ہوئی کہ یہ شیخ وفقیہ ابوعبداللہ بن دحون کے حلقہ درس میں شامل ہوگئے اور ایسی عمدہ صلاحیت پیدا کی کہ استنباط واستخراج میں اپنا جواب آپ ہوگئے۔

علم منطق میں انہیں محمد بن حسن مذجی القرطبی المعروف بابن الکنائی سے تلمذ کا شرف حاصل تھا۔

غرض علوم متداولہ کی تکمیل کے بعد یہ بھی منصب وزارت پر فائز ہوئے اور عبدالرحمان مستظہر باللہ بن ہشام بن عبدالجبار بن عبدالرحمان ناصر الدین اللہ اور پھر ہشام المعتد باللہ بن محمد عبدالملک بن عبدالرحمان الناصر کے دربار سے منسلک رہے۔ لیکن جلد ہی جاہ ومنصب سے متنفر ہوکر تصنیف وتالیف اور مطالعہ کی جانب مائل ہوئے اور علم فقہ، حدیث، اصول اور تاریخ وسیر سے متعلق موضوعات پر تقریباً چار سو کتابیں لکھیں۔

علامہ ابن حزم نہایت ذکی فہیم، سریع الحافظہ، کریم النفس اور متدین عالم تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے عہد کے بہت کم علماء ان کی چوٹ اور ملامت سے محفوظ رہے۔ ان کی ہجوگوئی اور ملامت سے سب ہی پناہ مانگتے تھے۔ اس لئے کہ ان کی زبان اور قلم کی قینچی جس وقت چلنے لگتی تو پھر امیر وغریب شاہ وگدا اور بزرگ وعزیز کی کوئی قید باقی نہیں رہتی تھی۔ چنانچہ ابوالعباس العریف نے ان کی اسی خصوصیت کو مد نظر رکھ کر یہ کہا کہ ''ابن حزم کی زبان حجاج بن یوسف ثقفی کی دودھاری تلوار ہے۔''

علامہ ابن حزم کو شعر وسخن سے بھی دلچسپی تھی۔ بطور نمونہ یاقوت حموی اور

ابن خلکان نے ان کے کافی اشعار کو اپنی اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے۔

علامہ ابن حزم ابتداء میں شافعی المسلک تھے لیکن بعد میں انہوں نے علماء ظواہر میں سے داؤد بن علی بن خلف اصبہانی کی اتباع شروع کر دی اور قرآن میں کسی تاویل وتشریح یا تفسیر کو فضول ہی نہیں بلکہ کفر کی حد تک برا کہتے تھے۔ انہیں امام ابوالحسن اشعری، امام ابوحنیفہ، اور امام مالک بن انس سے سخت اختلاف تھا۔

علامہ ابن حزم کی وفات اپنے گاؤں ہی میں جو کہ مغربی اندلس میں خلیج بحر اعظم کے کنارے واقع ہے ماہ جمادی الاول ۴۵۶ھ میں ہوئی۔

علامہ ابن حزم کی تصنیفات میں سے مندرجہ ذیل کا محض تذکرہ ملتا ہے۔ ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ موجود ہیں یا نہیں۔

الایصال الی فهم الخصال، کتاب فی الاجماع، کتاب فی مراتب العلوم، کتاب اظهار تبدیل الیهود و النصاری للتوراة و الانجیل کتاب التقریب بحد المنطق، کتاب الصادع و الرادع علی من کفر اهل التاویل فی فرق المسلمین و الرد علی من قال بالتقلید، کتاب فی شرح حدیث المؤطا، کتاب الجامع فی صحیح الحدیث، کتاب التلخیص، کتاب منتفی الاجماع، کتاب الامامة و السیاسة، کتاب اخلاق النفس، کتاب کشف الالباس ما بین اصحاب الظاهر و اصحاب القیاس، رسالة فی فضل الاندلس۔

جو چند کتابیں دستیاب ہو سکیں ان کا مختصر تعارف پیش ہے:

(۱) کتاب الفصل فی الملل و الا هواء النحل:

اس کا ایک مطبوعہ نسخہ مطبع مصر کا دو جلدوں میں میرے سامنے موجود ہے جس کے حاشیہ پر شہرستانی کی مشہور و معروف کتاب الملل والنحل شامل ہے۔ اس کی طباعت سب سے پہلے ۱۳۱۷ھ میں مصر ہی میں پانچ جلدوں میں ہوئی تھی۔

اس کتاب کو دنیا کے تمام مذاہب کی تنقیدی تاریخ کہا جا سکتا ہے کیونکہ

اس میں طبعیین نصاریٰ، یہود، صابیہ، اور سامرین کے مذاہب کے مطابق عالم کی اصل سے متعلق فلفسیانہ مباحث ہیں۔ پھر توریت وانجیل پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے اس کی تحریفات وغیرہ پر مکمل ومدلل بحث کی گئی ہے۔ اور آخر میں اسلامی فرقوں کے عقائدو آراء کا ذکر کرتے ہوئے اعجاز قرآنی اور مسائل قدروعدل کی وضاحت کے بعد ایک علاحدہ فصل قائم کر کے انبیاء کی بعثت وعصمت وغیرہ بیان کی گئی ہیں۔ اور بطور خاص ان مسائل سے متعلق شیعہ، خوارج، معتزلہ اور مرجئیہ کے عقائد کا بالتفصیل تذکرہ ملتا ہے۔ اس عہد کے فلسفہ وجود اور طبعیات کی عقدہ کشائی بھی کی گئی ہے۔ غرض مختلف کلامی فرقوں کے اختلافی مباحث اور مختلف مذاہب کے عقائد پر اس کتاب میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

(۲) **جمهرة النسب فی معرفة العرب یا جمهرة الانساب**

اس کا ایک نسخہ مکتبہ خدیو مصر میں موجود ہے۔

(۳) **ابطال القیاس و الرائی و استحسان التقلید و التعلیل**

اس کا ایک نسخہ گوتھا لائبریری میں موجود ہے۔

(۴) **الناسخ و المنسوخ**

یہ کتاب تفسیر جلالین کے حاشیہ پر مصر سے چھپی تھی۔

(۵) **الاحکام لاصول الاحکام فی اصول الدین**

اس کا ایک نسخہ مکتبہ خدیو مصر میں ہے۔

(٦) **طوق الحمامة فی الادب**

یہ کتاب علامہ کی ابتدائی کتابوں میں سے ہے جس کے بارے میں علامہ نیاز فتح پوری لکھتے ہیں کہ اس کا علم سب سے پہلے "Dozy" کے ذریعہ ہوا تھا۔ یہ کتاب فلسفہ محبت پر نفسیاتی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے اور لندن سے طبع ہوئی ہے۔

نوٹ: اندلس کے علماء میں علامہ ابن حزم کے علاوہ پانچویں صدی ہجری تک کے کسی دوسرے متکلم کے حالات میرے علم میں تفصیلی طور پر نہ آسکے اس لئے مجبوراً

صرف ان کے تعارف وحالات پر اکتفا کرنا پڑا۔لیکن ابن حزم نے لکھا ہے کہ ان سے پہلے بھی کتب کلامیہ کی تصنیفات کا سلسلہ اندلس میں شروع ہو چکا تھا جن میں خلیل بن اسحاق، یحیٰ بن سمنیہ، موسیٰ بن جدیر، احمد بن وغیرہ شہرت رکھتے تھے۔

(ماخذ: وفیات الاعیان جلد اول، معجم الادباء جلد ۱۲، اخبار الحکماء، کتاب تاریخ آداب اللغۃ جلد ۳، نگار سالنامہ ۱۹۵۵ء)

امام الحرمین جوینی

۴۱۹ھ ۴۷۸ھ

نام عبد الملک، کنیت ابو المعالی، لقب ضیاء الدین اور امام الحرمین کے نام سے مشہور تھے۔ سلسلہ نسب اس طرح ہے۔

عبد الملک بن الشیخ ابی محمد عبد اللہ ابی یعقوب یوسف بن عبد اللہ بن یوسف بن محمد بن جویہ الجوینی۔

ابن خلکان کی تحریر کے مطابق جوینی جوین کی جانب منسوب ہے جو نیشاپور کا ایک بڑا علاقہ تھا جس میں بہت سے قریہ آباد تھے۔ اسی علاقہ کو ان کا وطن ہونے کا شرف حاصل ہے۔

امام جوینی کا خاندان علم وفضل کے اعتبار سے ابتداء ہی سے ممتاز رہا ہے۔ خود امام جوینی کے والد عبد اللہ جوینی ایک باکمال مفسر، فقیہ اور عالم دین تھے جنہوں نے اپنے والد یوسف بن عبد اللہ کی آغوش تربیت سے فیض حاصل کیا تھا۔ غرض اسی علمی و

دینی گھرانے میں امام جوینی نے ۱۸ ارمحرم الحرام ۴۱۹ھ کو آنکھیں کھولیں۔

ذہانت وفطانت میں یہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔اپنے والد کے حلقہ درس میں شامل ہوکر ۲۰ رسال ہی کی عمر میں تمام متداولہ علوم وفنون سے آراستہ ہونے کے بعد اپنے والد کی کتابوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تحقیق وتدقیق کے بعد ان تصنیفات پر انہوں نے مناسب اضافے بھی کئے اور بڑی باریکیاں بھی پیدا کیں۔ اپنے والد کی وفات کے بعد ان کی جگہ پر امام جوینی مسند درس پر جلوہ افروز ہوئے۔ لیکن درس وتدریس سے جلد ہی کنارہ کش ہوکر استاذ ابوالقاسم اس کافی اسفرائینی کی خدمت میں حاضر ہوکر مدرسہ بیہقی میں علم الاصول (علم کلام) کی تحصیل کی۔

کلامی مسائل میں ان کا رجحان اشاعرہ کی طرف تھا۔ چنانچہ سلجوقی سلطان طغرل بیگ کے زمانہ میں جب اس کے وزیر عبدالملک نے اشعری جماعت کی مخالفت شروع کی اوران کو تکلیف پہنچانے کے درپے ہوا تو امام جوینی بغداد چلے آئے جس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کو علماء بغداد کی ایک بڑی جماعت سے استفادہ اور تبادلہ خیال کا زبردست موقع ملا۔لیکن ان کا قیام بغداد میں بھی زیادہ دنوں تک نہ رہ سکا اور یہ عازم ارض مقدس حجاز ہوئے وہاں پہنچ کر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں چار سال تک درس وتدریس اور استفادہ کا سلسلہ جاری رکھا اوراسی وقت یہ امام الحرمین کے نام سے مشہور ہوئے۔

سلطان الپ ارسلان کے اوائل عہد میں جب نظام الملک طوسی وزیر ہوا تو یہ نیشاپور واپس آ گئے اور نظام الملک کے بنوائے ہوئے مدرسہ نظامیہ میں آخر عمر تک لوگوں کو دینی تعلیم دیتے رہے۔وعظ وپند اور مناظرہ کی مجلسوں میں بھی یہ خصوصی طور پر شریک ہوتے تھے۔چنانچہ سبکی نے طبقات میں کئی مناظروں کا خصوصی طور پر تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔

امام جوینی تصنیفات وتالیفات کے میدان میں بھی خاصی شہرت کے

حامل تھے۔ زور بیان اور انداز تقریر کا یہ عالم تھا کہ جب مضامین تصوف اور اقوال صوفیاء کی تشریح کرنے لگتے تو اس دردناک انداز میں کرتے کہ سارے سننے والے اشکبار ہو جاتے۔

آخر عمر میں جب ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو تبدیل آب وہوا کے لئے انہیں نیشاپور کے ایک قریہ شتنقان میں منتقل کر دیا گیا اور وہیں یہ آفتاب علم وادب اور ماہتاب دین وملت تقریباً چار سو تلامذہ کو سوگوار اور ساری اسلامی دنیا کو ماتم کناں چھوڑ کر شب چہار شنبہ مورخہ ۲۵ ربیع الاول ۴۷۸ھ کو دار البقاء کو کوچ کر گیا۔ ان کی نماز جنازہ ان کے فرزند ابوالقاسم نے پڑھائی اور جسد خاکی کو نیشاپور لا کر دوسرے روز ان کے مکان ہی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ پھر دو سال بعد ان کی نعش کو وہاں سے منتقل کر کے مقبرہ حسین میں ان کے والد کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

تصنیفات: ابن خلکان نے لکھا ہے کہ امام الحرمین نے ہر موضوع اور فن پر کتابیں لکھی ہیں اور ان کی مندرجہ ذیل کتب کا نام خاص طور پر بیان کیا ہے، جس سے کسی حد تک ان کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

کتاب نهاية المطلب فی دراية المذهب، الشامل (اصول دین میں) البرهان (اصول فقہ میں) تلخيص التقريب، الارشاد، عقيدة النظاميه، مدارک العقول (نامکمل) تلخيص نهايت المطلب (نامکمل) غياث الامم فى الامامة، مغيث الخلق فى اختيار الاحمق، غنية المسترشدين فى الخلاف.

(ماخذ: وفيات الاعيان جلد اول،
طبقات الشافعيه الكبرى از سبکی جلد ۳)

قاضی ابو یوسف معتزلی

۳۹۳ھ ۴۸۸ھ

ابو یوسف عبد السلام بن محمد بن یوسف بن بندار کی ولادت ۳۹۳ھ میں قزوین میں ہوئی۔ اسی نسبت سے انہیں قزوینی بھی کہتے ہیں۔

انہوں نے مختلف علوم وفنون کی تکمیل قاضی عبد الجبار معتزلی اور قاضی ابو القاسم بن کج کے حلقہ درس میں شامل ہو کر کی۔ خود ان کے تلامذہ کا بھی حلقہ بہت وسیع تھا۔ قزوینی نے اپنے پیدائشی گاؤں کو چھوڑ کر بغداد کی بودوباش اختیار کر لی تھی۔ لیکن ذوق سفر وسیاحت نے انہیں بغداد میں اطمینان سے نہ رہنے دیا اور یہ ملک شام اور مصر میں ایک مدت تک قیام کرنے کے بعد پھر بغداد لوٹ آئے۔ علم وادب کا ذوق انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ کتابوں کی محبت اور اہمیت ان کی نظر میں کچھ زیادہ ہی تھی۔ بعض نادر و نایاب کتابیں بھی ان کے ذخیرے میں موجود تھیں جن کا تذکرہ اکثر اپنے ہم جلیسوں سے کیا کرتے تھے اور ان کی قدر و قیمت سے آگاہ کیا کرتے تھے۔ اکثر انہیں یہ کہتے بھی سنا گیا۔

ملکت نفیسین منهما تفسیر ابن جریر الطبری فی اربعین مجلد و تفسیر ابی القاسم البلخی و ابی علی الجبائی و ابنه ابی هاشم و ابی مسلم بن بحر و غیرهم (دو عمدہ چیزیں مجھے ملیں ایک ابن جریر طبری کی تفسیر جو چالیس جلدوں میں ہے دوسری ابو القاسم بلخی اور ابو علی جبائی اور ان کے لڑکے ابو ہاشم اور ابو مسلم بن بحر کی تفسیریں ہیں)

ایک بار انہوں نے نظام الملک کی خدمت میں تحائف پیش کئے تو اس نے بھی چار نادر و نایاب کتابیں ان کی خدمت میں پیش کیں۔ اس طرح کتابوں سے

انہوں نے اپنی محبت کی ایک اعلیٰ ترین مثال پیش کی ہے۔قزوینی اگرچہ ملک مصر کی سیر وسیاحت کے لئے گئے تھے لیکن کتابوں کی محبت وذوق نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ چنانچہ جب وہاں سے واپس لوٹے تو ان کے ہمراہ دس اونٹوں پر کتابیں لدی ہوئی تھیں جو مختلف علوم وفنون سے متعلق تھیں۔ان کتابوں میں سے اکثر انہوں نے مصر کے مختلف علماء سے گفتگو کر کے اپنے انداز بیان سے متاثر کر کے حاصل کی تھیں بعض کتابوں کو انہوں نے قیمتاً حاصل کیا تھا۔

قزوینی عقائد کے اعتبار سے زیدی تھے اور فخریہ طور پر اپنے عقیدے کا اظہار کرتے تھے۔انہوں نے نظام الملک کے سامنے بھی اپنے عقیدے کا اظہار کرنے میں تامل نہیں کیا۔

قزوینی کی وفات بغداد میں ماہ ذی قعدہ ۴۸۸ھ میں ہوئی۔انہوں نے ''تفسیر کبیر'' کے نام سے کلام اللہ کی ایک تفسیر بھی لکھی ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سات سو جلدوں میں تھی۔اس میں مختلف کتابوں سے انہوں نے بہت سے مسائل کی وضاحت کے سلسلہ میں مدد لی تھی۔

(ماخذ: کل حالات ماخوذ از طبقات الشافعیہ جلد۳ صفحہ ۲۳۰)

علی بن حسن خلعی

۴۰۵ھ ۴۹۰ھ

ابوالحسن علی بن حسن بن حسین بن محمد کی ولادت مصر میں محرم الحرام ۴۰۵ھ میں ہوئی۔ ان کے اسلاف موصل کے رہنے والے تھے، لیکن ان کے والد حسن نے بغرض تجارت مصر میں سکونت اختیار کر لی۔ ان کا کاروبار کپڑے کا تھا، اس لئے خلعی کے نام سے مشہور ہوئے اور انہی کی نسبت سے علی بن حسن کو بھی اس نام سے موسوم کیا گیا۔

خلعی نے مندرجہ ذیل باکمال اساتذہ علم وفن کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور اپنی تعلیم مکمل کی۔ ابوالحسن حوفی، ابومحمد بن نحاس، ابوالفتح عداس، ابوسعید المالینی اور ابوالقاسم اہوازی۔ خلعی نے بلاد مشرق کا بھی سفر کیا لیکن مقصد سفر معلوم نہ ہو سکا۔ انہیں فقہ شافعی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ جب ان کے کمال کی شہرت ہوئی اور خلیفۂ وقت کو معلوم ہوا تو خلیفہ نے ان کو منصب قضاء پر فائز کر دیا لیکن خلعی نے صرف ایک ہی روز کے لئے منصب قضاء کو سنبھالا اور پھر مستعفی ہو کر قاہرہ چلے گئے اور وہاں اپنے عقیدت مندوں، پیروکاروں اور تشنگان علوم کو اپنے فیوض علمی سے سیراب کرتے رہے یہاں تک کہ قاہرہ کے مشائخ معتزلہ اور ائمہ وقت میں ان کا شمار ہونے لگا۔

خلعی کے تلامذہ میں حمیدی اور ابونصر احمد بن حسین شیرازی کا نام خاص طور پر ذکر ہے۔

حافظ ابوطاہر سلفی کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ خلعی بہت ہی بااصول اور اپنے درس حدیث کی اہمیت اور برکت سے پوری طرح واقف تھے۔ جب بھی حدیث کا درس ختم ہوتا تو پابندی کے ساتھ درج ذیل دعا پڑھتے۔ **اللهم ما منت به فتممه**

وما انعمت به فلا تسلبه وما سترته فلا تهتكه وما علمته فاغفره۔ ترجمہ: اے اللہ تو اپنا کامل احسان فرما اور جو تو نے انعام کیا ہے اس کو مت چھین اور جس کو تو نے صیغۂ راز میں رکھا ہے اس کو طشت از بام نہ کر اور جن گناہوں کو تو جانتا ہے ان کو معاف فرما۔

خلعی کی ولایت اور بزرگی سے متعلق بھی چند ایک روایتیں مشہور ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ایک روایت ابن خلکان نے اس طرح بیان کی ہے کہ ابونصر احمد بن حسن شیرازی نے ان سے ایک شعر کے متعلق دریافت کیا کہ اسے آپ نے اپنی یادداشت میں کہاں سے نقل کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ میں ایک دن دوپہر کے وقت بہت زیادہ پریشانی کے عالم میں ٹہل رہا تھا کہ میں نے کسی شخص کو یہ شعر پڑھتے ہوئے سنا لیکن تلاش کے باوجود شاعر کا پتہ نہیں چل سکا۔ اس کے بعد میں نے اسے یادداشت میں محفوظ کر لیا۔ وہ شعر یہ ہے

و ان امر دنیاہ اکبر ھمه لمستمسک منها بجبل غرور

اور اگر کسی کو دنیا نے عالی ہمتی کا حکم دیا تو اس بات کا بھی حکم دیا کہ وہ اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہے جو اٹل پہاڑ کی مانند ہے۔

خلعی کا انتقال مصر میں روز شنبہ ۱۶ / یا ۱۸ / ذی الحجہ ۴۹۰ھ میں ہوا۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ یہ نہایت عمدہ عمدہ کتابوں کے مصنف بھی تھے جن میں سے ''خلعات'' کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔

(ماخذ: کل حالات ماخوذ از وفیات الاعیان جلد اول صفحہ ۳۳۸)

حجۃ الاسلام امام محمد غزالی

۴۵۰ھ ۵۰۵ھ

حجت الاسلام زین الدین ابو حامد محمد بن محمد بن احمد غزالی طوسی کی ولادت ملک خراسان کے شہر طوس میں ۴۵۰ھ مطابق ۱۰۵۸ء میں ہوئی۔ ان کے والد محمد بن محمد ایک عابد و زاہد شخص تھے اور حصول معاش کی خاطر کپڑا بننے کا پیشہ کئے ہوئے تھے۔ اپنے والد کے پیشے کی مناسبت سے لفظ غزالی سے ملقب ہو گئے۔ محمد بن محمد کے دو فرزند تھے۔ ایک محمد غزالی اور دوسرے احمد۔ یہ دونوں بچے ہی تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان کی سرپرستی اور نگہداشت کا ذمہ ابو حامد احمد بن محمد رادکانی نے اپنے سر لیا۔ انہی کی نگرانی میں محمد غزالی کی ابتدائی تعلیم مکمل ہوئی۔ اس کے بعد مزید تحصیل علم کے لئے طوس سے جرجان ہوتے ہوئے نیشاپور پہنچے اور فقیہ وقت امام المتکلمین امام الحرمین ابو المعالی جوینی کی خدمت میں حاضر ہو کر فنون جدل و مناظرہ، علم کلام اور فلسفہ سے آراستہ و پیراستہ ہوئے۔ ابھی ۱۸ ہی سال کے تھے کہ اللہ نے ان کو علوم و فنون متداولہ یعنی ادب، فقہ، اصول فقہ، حدیث، درایت، علم کلام، مناظرہ اور امثال میں مہارت تامہ عطا کی۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

جوینی نے غزالی کے کمال اور تبحر علمی سے متاثر ہو کر ان کو پوری زندگی اپنے ساتھ رکھا اور جب ۴۷۸ھ میں ان کا انتقال ہوا تو امام غزالی نیشاپور سے قریب ہی خواجہ نظام الملک طوسی کے فضل و کمال کی شہرت سن کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نظام الملک نے ان کا بہت ہی احترام کیا اور بڑے اعزاز کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا۔ اپنے سامنے مجلس مناظرہ منعقد کرائی جس میں فقہاء اور غزالی کے درمیان

مناظرہ ہوا۔ ان کے فضل وکمال سے بہت متاثر ہوئے۔ اس کے آٹھ سال بعد امام غزالی تقریباً ۳۵ سال کی عمر میں مدرسہ نظامیہ بغداد میں منصب تدریس پر فائز ہوئے۔ اور ۴۸۴ھ کے بعد سے چار سال تک بغداد میں درس وتدریس، وعظ، مذاکرہ، مناظرہ اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جس میں غزالی نے کتب فلسفہ کا مطالعہ نہایت انہماک کے ساتھ کیا اور ان سے متاثر ہوکر مسائل کلامیہ کی گرہ کشائی کی طرف مائل ہوئے۔

امام غزالی جب ۳۹ رسال کے ہوئے تو انہیں ایک زبردست انقلاب سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کا دل دنیا ومافیہا سے کچھ اس طرح اچاٹ ہوگیا کہ درس و تدریس کے سلسلہ کو بھی انہوں نے خیر آباد کہہ دیا۔ اپنی جگہ پر اپنے بھائی احمد غزالی کو مدرسہ نظامیہ بغداد کا مدرس بنا کر بظاہر سفرحج کے ارادہ سے بغداد سے روانہ ہوئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ منازل سلوک اور راہ تصوف کو ریاضت ومجاہدہ کے ذریعہ طے کرنے کی نیت سے بغداد اور علائق دنیوی سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اور دس سال تک شام، الجزائر، بیت المقدس اور حجاز کی بادیہ پیمائی کی۔ اس مدت میں زہد وعبادت کے علاوہ تصنیف وتالیف کے کام سے بھی غافل نہ رہے۔ ۴۹۸ھ میں طوس واپس آئے اور ایک ہی سال بعد سلطان سنجر اور اس کے وزیر فخر الملک بن نظام الملک کی استدعاء پر اوائل ۵۰۰ھ میں نیشاپور گئے۔ اور وہاں کے مدرسہ میں درس کا سلسلہ شروع کیا لیکن ۵۰۰ھ ختم ہوتے ہوتے پھر طوس واپس آگئے۔ اور گھر کے نزدیک جو خانقاہ اور مدرسہ تھا اس میں شاگردوں اور عقیدت مندوں کی تعلیم اور رشد وارشاد میں مشغول ہوئے۔ پھر کسی کی بھی استدعا پر طوس چھوڑ کر بغداد یا نیشاپور نہیں گئے۔

امراء اور سلاطین سلطنت کی خوشنودی کا بھی خیال دل سے نکل گیا۔ مال و دولت کی ہوس بھی باقی نہ رہی۔ بس زہد وقناعت کو اپنا پیشہ بنایا اور بقیہ زندگی گوشہ نشیں یا خلق خدا کی رہبری میں گزار دی۔ یہاں تک کہ دوشنبہ مورخہ ۱۴ر جمادی الآخر ۵۰۵ھ

میں حاکم حقیقی کی جانب سے طلبی آئی اور ہنسی وخوشی جان جاں آفریں کے سپرد کی اور طائران کے مقبرہ میں پیوند خاک ہوئے۔

(علامہ شبلی کی الغزالی کے بعد حضرت امام غزالی کی سوانح حیات پر قلم اٹھانے کی مزید گنجائش ہی کہاں باقی رہتی ہے۔اس کے علاوہ سن وفات کے اعتبار سے یہ میری حد تحقیق سے خارج بھی ہے۔صرف ان کی تصنیفات کی وجہ سے جو زیادہ تر پانچویں صدی ہجری میں منظر عام پر آ چکی تھیں،ان کا تذکرہ شامل کرنا پڑا۔اس میں اختصار کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔اوراس سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ علامہ شبلی کی ''الغزالی'' مقدمہ المنقذ من الضلال تحقیق کردہ محمد جابر مقدمہ تہافتہ الفلاسفہ تحقیق سلیمان دنیا،صحبۃ الغزالی تالیف ابی بکر عبدالرزاق،سرگزشت غزالی مصنفہ محمد حنیف ندوی اورتاریخ ادبیات ایران جلد۲ صفحہ ۹۲۱ کے پیش نظر یہ حالات ترتیب دئے گئے ہیں۔)

تصنیفات غزالی

علمائے متکلمین،صوفیا اور فلاسفہ کی نظر میں امام غزالی کا مقام بہت بلند ہے۔انہوں نے ایسی ایسی نادرونایاب کتابیں تصنیف کی ہیں اوراس طرح علم کلام اور علم تصوف کی خدمت کی ہے کہ ان کا احسان رہتی دنیا تک رہے گا۔غزالی کی تصنیف کردہ کتابوں کی تعداد کا تعین ممکن نہیں۔بعض مورخین نے لکھا ہے کہ کتابوں کی تعداد ستر سے بھی متجاوز ہے۔ان میں فارسی اور عربی دونوں ہی زبانوں کی تصنیفات شامل ہیں۔یہ غزالی کا علمی وادبی کمال ہے کہ جس طرح وہ عربی زبان پر قادر نظر آتے ہیں اسی طرح اپنی مادری زبان کے ناطے فارسی میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔تصنیف وتالیف کے میدان میں اگرچہ فلسفہ کا خشک موضوع ہی کیوں نہ ہو اچھے اچھوں سے بازی لے جاتے ہیں اور بڑے حسین انداز اور لطیف پیرایہ میں گلکاری کرتے نظر آتے ہیں۔

مختلف کتابوں کے مطالعہ کے بعد غزالی کی تصنیف کردہ کتابوں کی ایک فہرست تیار ہوئی ہے جو مندرجہ ذیل ہے:

(۱)	احیاء علوم الدین	(۱۶)	الاقتصاد فی الاعتقاد
(۲)	المنقذ من الضلال	(۱۷)	الجام العوام عن علم الکلام
(۳)	الذی نحن الآن بصدرہ	(۱۸)	المستصفی
(۴)	عمدۃ المحققین	(۱۹)	الوجیز
(۵)	تھافتہ الفلاسفہ	(۲۰)	آداب الصوفیہ
(۶)	الدرۃ الفاخرہ	(۲۱)	الکشف والتبیین
(۷)	مکاشفتہ القلوب	(۲۲)	معارج القدس فی مدارج معرفتہ النفس
(۸)	منھاج العابدین	(۲۳)	جواہر القرآن
(۹)	بدایۃ الہدایۃ	(۲۴)	الاربعین فی اصول الدین
(۱۰)	سیر العالمین	(۲۵)	میزان العمل
(۱۱)	المضنون بہ علی غیر اہلہ	(۲۶)	معیار العمل
(۱۲)	الاجوبۃ الغزالیۃ والمسائل الاخرویۃ	(۲۷)	مقاصد الفلاسفہ
(۱۳)	محک النظر	(۲۸)	القصیدۃ الھائیہ
(۱۴)	المقصد الاسنی	(۲۹)	القصدیۃ التائیہ
(۱۵)	الحکمتہ فی مخلوقات اللہ	(۳۰)	الجواہر الغزالی

جواہر الغزالی میں مندرجہ ذیل دس رسائل شامل ہیں

(ا)	کیمیائے سعادت	(ب)	الرسالتہ الافیہ
(ج)	الادب فی الدین	(د)	ایہا الولد
(ہ)	فیصل التفرقہ	(ز)	القواعد العشرۃ
(ح)	مشکوۃ الانوار	(ط)	رسالتہ الطیر
(ی)	رسالتہ الوعظیہ	(ک)	القسطاس المستقیم

(المنقذ من الضلال مقدمہ)

(۳۱) البسیط (۳۵) تحصین الدلۃ

(۳۲) الوسیط (۳۶) اسماء الحسنیٰ

(۳۳) الخلاصہ (۳۷) الرد علی الباطنیۃ

(۳۴) المنخول (۳۸) شفاء العلیل

تصنیفات کا تعارف

مذکورہ بالا کتابوں میں سے اکثر کتابیں مطبوعہ یا قلمی شکل میں دستیاب ہیں جن کا مختصراً تعارف درج ذیل ہے:

(۱) احیاء العلوم

یہ کتاب ۴ جلدوں میں مطبع عثمانیہ مصر کی طبع کردہ پیش نظر ہے۔ جس کے حاشیہ پر مندرجہ ذیل ۳ کتابیں بھی شامل ہیں۔

(الف) کتاب تعریف الاحیاء بفضائل الاحیاء مصنفہ شیخ عبدالقادر بن عمید الدین شیخ بن عبداللہ العبداوس باعلوی۔

(ب) کتاب الاملاء عن اشکالات الاحیاء: اس کتاب میں بعض معاصرین کے ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ جو احیاء العلوم کے بعض مسائل پر کیے گئے ہیں، نیز بعض مقامات کی تشریح بھی موجود ہے۔

(ج) عوارف المعارف: مصنفہ خواجہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ

احیاء العلوم کی ابتداء کتاب العلم سے کی گئی ہے اور اس موضوع کو سات فصلوں پر تقسیم کر کے علم کی فضیلت، اہمیت، تقسیم اور طریقہ حصول علم وغیرہ پر مفصل و مدلل بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد عقائد کی بحث شروع ہوتی ہے۔ جس کے تحت ایمان، اسلام وغیرہ کی تشریح، صفات باری تعالیٰ کی وضاحت بڑے اچھے انداز میں کی گئی ہے۔ عقائد کی بحث کے بعد بقیہ ارکان اسلام کی ادائیگی کی صحیح صحیح ترکیب بتائی گئی جس میں طہارت، نماز، ادعیہ اور اخلاقیات پر بھی بحث ملتی ہے۔ اس کے بعد روحانی منازل

طے کرنے کے بعد راہ سلوک کے نکات، صوفیا کے اقوال اور مسالک پر سیر حاصل بحث ہے

ابتداء کتاب دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پوری کتاب فقہی مسائل پر مشتمل ہے لیکن جیسے جیسے آگے بڑھتے جایئے یہ حقیقت واضح ہوتی جاتی ہے کہ یہ کتاب ان لوگوں کے لئے ایک انمول اور بیش بہا تحفہ ہے جو تزکیہ باطن اور صفائی قلب کے خواہاں ہیں۔ راہ سلوک اور تصوف کی کتابوں میں اس کتاب کو اسی وجہ سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یا یہ کہ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عربی میں صوفیا کے مسلک کے مطابق اتنی جامع اور مانع کتاب آج تک نہ لکھی جا سکی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کی پذیرائی امام غزالی کی زندگی میں ہی بڑے جوش و خروش کے ساتھ کی گئی۔ جب اس کی اہمیت اور فوائد کا علم اہل فارس اور امام غزالی کے ہم وطنوں کو ہوا تو وہ عربی زبان سے ناواقفیت کی بناء پر تڑپ اٹھے۔ انہیں اس عظیم ملی سرمایہ سے فائدہ نہ اٹھانے کا بڑا زبردست افسوس اور قلق ہوا۔ بالآخر انہوں نے اپنے اس جذبہ کا اظہار امام غزالی کے سامنے کر ہی دیا۔ امام غزالی نے اپنے ہم وطنوں کی خواہش و جذبہ کا احترام کرتے ہوئے ان کے فائدے کے خیال سے اس کا خلاصہ فارسی زبان میں پیش کرنے کا ارادہ کر لیا اور اس ارادہ نے دس سال کے بعد ''کیمیائے سعادت'' کی صورت میں ظاہر ہو کر تکمیل کا لباس پہن لیا۔

(۲) کیمیائے سعادت (فارسی)

اس کتاب کا ایک نسخہ مطبوعہ ''چاپخانہ و کتاب فروش مرکزی تہران'' ۱۳۱۹ھ پیش نظر ہے۔ اس سے قبل ہندوستان میں تین بار اس کی طباعت ہو چکی ہے۔ ہندوستان ہی کے ان مطبوعہ نسخوں کی تصحیح و تحشیہ کے بعد اسے مذکورہ مطبع سے دو جلدوں میں شائع کیا گیا۔

یہ کتاب احیاء العلوم کا فارسی زبان میں خلاصہ ہے اس لئے اس کا موضوع بھی وہی ہے جو احیاء العلوم کا ہے۔ فرق صرف زبان کا ہے۔ کتاب کی وجہ تسمیہ اور غرض

وغایت کے سلسلہ میں امام غزالی خود تمہید کتاب میں فرماتے ہیں:

''وچنانکہ آن کیمیا کہ مس و برنج را بصفا و پاکی زر خالص رساند دشوار بود ہر کسی نشناسد ہم چنان آن کیمیا کہ گوہر آدمی را از خست بہمیت بصفا و نفاست ملکیت رساند تابداں سعادت ابدی یابد ہم دشوار بود ہر کسی نداند و مقصود ازین کتاب شرح اخلاط این کیمیا است کہ بحقیقت کیمیائے سعادت ابدیست و این کتاب بدین معنی ''کیمیائے سعادت'' نام کردیم'' (کیمیائے سعادت جلد اول صفحہ ۲)

ترجمہ: ''اور اس طرح وہ کیمیا جو تانبا اور پیتل کو خالص سونا کی طرح پاک و صاف کردے، یہ امر دشوار تھا اور ہر وہ شخص جو یہ نہیں جانتا کہ ایسا کیمیا جو آدمی کے وحشیانہ اور ذلیل حرکت کو دور کر کے پاک و نفیس اوصاف کا مالک بنادے تاکہ وہ ابدی سعادت حاصل کرلے جس کا حصول دشوار ہے اور جس کو ہر شخص نہیں جانتا۔ اس کتاب کا مقصد اس کیمیائی ملاوٹ کو واضح کرنا ہے جو حقیقت میں ابدی سعادت کی کیمیا ہے اور اس کتاب کا نام اسی وجہ سے ''کیمیائے سعادت'' رکھا ہے۔''

دوسری جگہ اس کتاب کی تصنیف کا مقصد ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

''وسر جملہ این کیمیا آنست کہ روئے از دنیا بگرداند و بخدائے تعالیٰ آرد''

''اس کیمیا کا اصلی مقصد یہ ہے کہ انسان دنیا کی طرف سے منہ پھیر لے اور اللہ کی جانب کامل توجہ دے۔''

دنیا سے روگردانی اور خدا سے دل لگانے کے لئے چار چیزوں کی معرفت کو ضروری بتاتے ہیں۔

(۱) اپنے آپ کو پہچاننا (۲) اللہ کو پہچاننا

(۳) دنیا کی حقیقت کو پہچاننا (۴) آخرت کی حقیقت کو پہچاننا

پھر حصول مقصد کے لئے چار ارکان کا لحاظ کرنا ضروری بتاتے ہیں جن میں سے دو کا تعلق ظاہر سے اور دو کا باطن سے ہے۔

ارکان ظاہری (۱) عبادت اور (۲) معاملات دنیا۔

ارکان باطنی (۱) مہلکات یا عقبات راہ دین یعنی بری باتوں سے دل کو پاک وصاف کرنا جیسے بخل، حسد، کبر اور عجب وغیرہ۔

(۲) منجیات: یعنی اچھے اخلاق و عادات سے دل کو آراستہ کرنا جیسے صبر، شکر، محبت، رجاء اور توکل وغیرہ۔

انہیں عنوانات مذکورہ کی تشریح وتوضیح پوری کتاب میں دلائل کے ساتھ کی گئی ہے۔

(۲) المستصفیٰ (دوجلدوں میں)

مطبوعہ مطبع امیریہ بولاق (مصر) ۱۳۲۲ھ

اس کتاب کے حاشیہ پر کتاب فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت ہے۔

کتاب مستصفیٰ اصول فقہ سے متعلق ہے، جسے امام غزالی نے اپنے ایام تدریس میں تصنیف کیا۔ اس کتاب کی کیفیت کے بارے میں تمہید کتاب میں خود ہی اس طرح رقم طراز ہیں:

اعلم ان هذ العلم الملقب باصول الفقه قدر تبناه و جمعنا ه فی هذا الكتاب و بیناه علی مقدمة و اربعة اقطاب المقدمة كاالتوطية و التمهید و الاقطاب هی المشتملة علی الباب المقصود ولنذكر فی صدر الكتاب معی اصول الفقه و حده و حقیقته اولاثم مرتبته ونسبته الی العلم ثانیا ثم كیفیته الشعابة الی هذه المقدمة و الاقطاب ثالثا ثم كیفیته اندراج جمیع اقسامه و تفاصله تحت الاقطاب الاربعة رابعا ثم وجه تعلیقه بهذه المقدمة خاصا (المستصفیٰ صفحه ۴)

جان لو کہ یہ علم جس کا لقب اصول فقہ ہے میں نے اس کتاب میں مرتب اور جمع کر دیا ہے۔ میں نے اس کی وضاحت ایک مقدمہ اور چار ابواب میں کر دی ہے۔

اس کا مقدمہ تردید وتوطیہ اور تمہید کی طرح ہے۔ اور ابواب میں اصل مقصود شامل ہے۔ہم کتاب کے آغاز میں سب سے پہلے اصول فقہ کے معنی، اس کی تعریف اور حقیقت کا ذکر کریں گے، پھر اس کے بعد اس کا مرتبہ اور دوسرے علوم سے اس کی نسبت کا ذکر کریں گے، اس کے بعد پھر اس کی گوناگوں کیفیات اس کے مقدمہ اور اقطاب اربعہ تک اس کے تمام اقسام کے اندراج کی کیفیت اور اس کی تفصیل کو اقطاب اربعہ کے تحت میں پھر اس کی وجہ تعلیق کو اس مقدمہ میں خاص کر بیان کریں گے۔

گرچہ عبارت مذکورہ سے کتاب کی پوری کیفیت اور ترتیب واضح ہو جاتی ہے۔ پھر بھی بعض ابواب اتنے اچھے پیرایہ میں تحریر کیے گئے ہیں جن کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ''حد اصول فقہ کا بیان'' جس کے تحت پہلے تو فقہ کی تعریف کی گئی ہے، اس کے بعد تمام دیگر علوم سے قطع نظر محض اس کا تعلق احکام شرعیہ سے ظاہر کرتے ہوئے ان احکام شرعیہ کی بنیاد تین چیزوں کتاب، سنت اور اجماع کو تسلیم کرتے ہوئے ان کو اصول فقہ کی حد بتایا ہے اور یہ لکھا ہے کہ انہیں سے اصول فقہ عبارت ہے۔ دوسرا باب علم فقہ کی اہمیت اور اس کے رتبہ کے بیان میں ہے، جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ دیگر علوم کے ساتھ علم فقہ کا کیا تعلق ہے اور کس طرح ایک اصولی کا متکلم، محدث، مفسر اور فقیہ ہونا ضروری ہے، غرض افادیت کے لحاظ سے یہ کتاب بھی عدیم المثال اور بے نظیر ہے

(۴) معارج القدس فی مدارج معرفة النفس

مطبوعہ مطبع سعادۃ بجوار محافظہ مصر ۱۹۲۷ء صفحات ۲۱۲

اس کتاب میں فلسفیانہ نکات کی تشریح ہے اور فلاسفہ کی طرح دلائل و براہین سے انسانی جسم، قلوب، قویٰ اور عقل وغیرہ کی ماہیت بیان کی گئی ہے۔ آخر کتاب میں اللہ تعالیٰ کے وجود اور صفات کے متعلق بھی مختصر سی بحث ملتی ہے لیکن وہ کافی اور شافی نہیں۔ موضوع کتاب کے متعلق امام غزالی مقدمہ کتاب میں اس طرح لکھتے ہیں:

ونحن نعرج فی هذ الکتاب من مدارج معرفة النفس الی

معرفة الحق و نذكر مخ مايودی الیه البراهین من حال النفس الا نسانية ولباب ماوقف علیه البحث الشافی من امرها و کونها منزهة عن صفات الاجسام و معرفة قواها و جنودها ومعرفة حدوثها و بقائها وسعادتها و شقاوتها بعد المفارقة علی وجه الکثیف الغطاء ویر فع الحجاب ویدل علی الا سرار المخزونة و العلوم المکنونة المضنون بها علی غیر اهله. ثم اذا ختمنا فصول معرفة النفس فحینئذ فنعطف علی معرفة الحق اذا جمیع العلوم مقدمات و وسائل لمعرفة الاول الحق (معارج القدس ص ۴)

(ترجمہ) اور میں نے اس کتاب میں معرفتِ حق کا تعلق مدارج نفس کے ساتھ دکھایا ہے ساتھ ہی ساتھ میں اس مغز کا تذکرہ کروں گا جو اس بحر بیکراں کی طرف پہنچائے اور اس نرمی کا ذکر کروں گا جو نفس انسانی کے حال سے زیادہ نرم ہے اور وہ اصل مقصود جس کا دارومدار بحث پر ہے۔ جو اس امر کے لئے کافی ہے۔ اور اس ذات باری کا صفات اجسام سے مبرا و پاک ہونا۔ اس کے قویٰ، لشکر، بقاء حدوث اور سعادت وشقاوت نفس کی معرفت موت کے بعد اس طرح کہ اس کے چہرے پر سے پردہ اٹھ جائے اور اسرارمخزونہ وعلوم پوشیدہ جو محفوظ ہیں اور جو اس کے حامل نہیں ان پر ظاہر ہو جائے۔ پھر جب ہم معرفت نفس کے فصول ختم کریں گے تو معرفت حق کی جانب متوجہ ہوں گے کیوں کہ جمیع علوم مقدمات اور معرفت کے حق و وسائل ہیں۔

(۵) القصیدة الهائیه

کتاب ''معارج القدس'' کے اختتام پر بہ زبان عربی دو قصیدے قصیدہ ہائیہ اور قصیدہ تائیہ کے نام سے شامل ہیں۔ قصیدہ ہائیہ میں صرف ۶۴ شعار ہیں جن کی ابتدا درج ذیل شعر سے ہوتی ہے

ما بال نفسی تطیل شکواها الی الوریٰ وهی ترتجی الله

ترجمہ: میرا نفس لوگوں کی لمبی لمبی شکایتوں کی پرواہ نہیں کرتا، کیونکہ وہ ہمیشہ اللہ سے خیر کی امید رکھتا ہے۔

پورا قصیدہ اخلاقی مضامین پر مشتمل ہے۔ بعض اشعار میں اپنی نادانستگی، عدم واقفیت، جہل اور مقصد تخلیق سے لاعلمی اور بے پرواہی پر اظہار افسوس بھی کیا گیا ہے۔ چنانچہ درج ذیل اشعار اس کی بڑی اچھی مثال کہے جاسکتے ہیں۔

لو علمت بعض ماله خلقت　　　احزنها علمها وابکا ها

اگر کوئی شخص جان لے کہ اس کی تخلیق کیوں ہوئی ہے، تو اس کو اس کا یہ علم مغموم کردے گا اور رلائے گا۔

لو لم تعرف الله حق معرفة　　　بصحت برها و تقوا ها

کسی کو اگر اللہ کی معرفت حاصل ہوجائے، تو یہ سمجھو کہ اس کی نیکی اور تقویٰ خالص ہے

لکنها جهلها بخا لقها　　　اغفلها رشدها و ایها مها

لیکن اپنے خالق سے جہالت اس کو رشد اور ایہام سے غافل کردیتی ہے

یا ویح نفسی و ابویح حق لها　　　ان صد ها ربها و ارا د ها

ہائے افسوس میرا نفس اور یہ افسوس کرنا درست ہے اگر اس کا رب اس کو بند کردے اور رد کردے

(۶)　　القصيدة التا ئيه

یہ قصیدہ کتاب ''معارج القدس'' میں قصیدہ ھائیہ کے بعد صفحہ ۲۱۶ سے شروع ہوکر ۲۲۳ پر ختم ہوتا ہے۔ جس کا پہلا شعر یہ ہے

بنور تجلی وجه قد سک د هشتی

وفیک علی ان الا خفا بک حیرتی

تیرے چہرے کے نور تجلی نے میری دہشت کا دروازہ بند کردیا اور تیرے معاملہ میں مجھ کو اس بات پر حیرت ہے کہ تجھ پر کوئی شئے مخفی نہیں ہے۔

اس قصیدہ کا موضوع بھی قصیدہ ھائیہ ہی کی طرح ہے لیکن اس میں اس بات پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ انسان کے لئے خواہشات نفسانی اور دنیاوی کی اتباع کرنے یا شکوہ شکایت کرنے سے بہتر یہی ہے کہ صبر و شکر کے ساتھ زندگی گزارے۔ چنانچہ کہتے ہیں

فمن یشک یوما فی ھو اہ فاننی
لی الشکر اولی فی الھوی من شکیتی

اگر کسی کو کسی دن خواہشات نفسانی کے معاملہ میں شک تھا تو وہ میں ہوں۔ لیکن اب معاملات عشق میں شکوہ شکایت سے بہتر میں اس کی شکرگزاری سمجھتا ہوں۔

تسترت جھدی فی ھواک و طاقتی
فلما منعت الصبر ابدیت صفحتی

میری کوشش تیری محبت میں پوشیدہ ہوگئی اور جب بھی تو نے صبر سے منع کیا تو میں نے اس میں اپنی بے صبری کی حد کردی۔

امام غزالی اس قصیدہ میں ارکان اسلام کی پابندی کرتے ہوئے تصحیح عقائد پر بھی زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں :-

ولولم أودا لفرض منی الی لم
یصح بوجہ لی ولم تبر ذمتی

جو فرض مجھے سونپا گیا اگر کسی وجہ سے اس فرض کو میں نے ادا نہیں کیا تو پھر میں ذمہ سے بری نہیں ہوں گا۔

و کنت علی انی اوجد طاھرا
ففی باطنی قددنت بالثنویۃ

اور اس حالت پر میں سب سے زیادہ پاک ہوں اور اپنے باطن کو کبھی میں نے آلودہ

نہیں کیا۔

کذا من یکن قد صح عقد و دادہ

ولم یتھم یوما بسقم عقیدۃ

اسی طرح وہ شخص ہے جس کا عقیدہ ہمیشہ نیک رہا اور کسی دن عقیدہ کی کمزوری میں مبتلا نہیں ہوا۔

(۷) المنقذ من الضلال

ایک نسخہ مطبوعہ مطبع جندی مصر پیش نظر ہے جس میں ۱۳۵ صفحات ہیں۔ اس کتاب کو امام غزالی کی سرگزشت تصور کیا گیا ہے، جس میں انہوں نے بالتفصیل یہ بتایا ہے کہ وہ عام روش سے ہٹ کر جاہ و منزلت کو ٹھکرا کر تصوف کی دشوار گزار راہ پر کیوں گامزن ہوئے۔ اس میں انہوں نے اپنے پرانے خیالات و افکار کا دیانت داری سے تجزیہ کیا ہے۔ نفس کو ٹٹولا ہے اور اس سلسلہ کے تمام فتنوں اور گمراہیوں کو اچھی طرح بھانپا ہے۔ تھک ہار کر مایوسی کا اظہار نہیں کیا بلکہ تلاش حق میں ان تمام پریشانیوں اور ناکامیوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے جو اس راہ میں پیش آسکتی ہیں۔ انہوں نے اپنی مخلصی اور سچائی کی راہیں خود تلاش کی ہیں۔ کسی کی تقلید نہیں کی۔ مزید براں تمام واردات کو بھی نہایت صداقت اور اخلاص کے ساتھ بیان کر دیا ہے جن سے وہ اس دور میں دوچار ہوئے۔

امام غزالی نے ابتداء کتاب میں یہ بیان کیا ہے کہ کس طرح وہ شروع ہی سے تقلید کے چکر سے آزاد رہنا چاہتے تھے۔ اور اس خواہش نے کس طرح فلسفہ کی خطرناک گھاٹیوں اور اس کے پیچ وخم میں لا ڈالا۔ اور وہ پھر اس سے کس طرح آزاد ہو کر زمرہ صوفیا میں شامل ہوئے۔ پھر آخر میں صوفیا کے اخلاق و عادات پر اعتماد ظاہر کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ یہی ایک گروہ ہے جو روشن خیالی اور روشن ضمیری کے ساتھ تزکیہ نفس کی نعمتوں سے پوری طرح مالا مال ہے۔ کیونکہ ان کے یہاں تصوف و سلوک

کی راہ پر گامزن ہونے کی شرط ہی یہی ہے کہ خواہشات انسانی اور جذبات نفسانی سے کنارہ کش ہو کر ذہن و قلب اور عقل و فکر کو ریاضت و مجاہدہ سے اس طرح صیقل کرنا اور چمکانا ہو گا کہ نور الٰہی منعکس ہو سکے۔ اور اس سلسلہ میں انہوں نے اپنی دس سالہ زہد و عبادت کی زندگی کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی کامرانی اور فائز المرامی کے واقعات اختصار کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ غرض یہ کتاب امام غزالی کی فلسفیانہ اور متکلمانہ زندگی سے گریز اور صوفیانہ و زاہدانہ زندگی میں داخل ہونے کی مکمل سرگزشت ہے۔

(۸) تھافۃ الفلاسفہ

تحقیق و تحشیہ سلیمان دنیا۔ مطبوعہ دار المعارف مصر کا ایک نسخہ پیش نظر ہے۔ اس کتاب کے آغاز میں ۵۶ صفحات پر مشتمل سلیمان دنیا کا امام غزالی کے اسلوب سوانح اور فلسفہ وغیرہ پر ایک تحقیقی مقالہ شامل ہے۔ اور یہ مقالہ قابل قدر ہے۔ اس کے بعد اصل کتاب کا مقدمہ ہے جو خود امام غزالی کا تحریر کردہ ہے۔ جس میں انہوں نے اس کتاب کی تصنیف کا سبب بیان کیا ہے جو درج ذیل ہے:-

''میں نے مسلمانوں کو ظاہری طور پر ارکان اسلام کی پابندی اور باطنی طور پر شعائر دینی کی تحقیر، عبادت شرعی و ملی کی اہانت، یہود و نصاریٰ کی تقلید اور اہل ہوا و ہوس اور بدعتیوں کے خیالات فاسدہ اور عقائد مکروہہ کی تائید کرتے ہوئے پایا۔ اور سوائے سقراط، بقراط، افلاطون اور ارس طالیس کے کسی کا نام آج کل کے مسلمانوں کو نہ لیتے ہوئے پایا تو مجھے اس کتاب کی تحریر پر آمادہ ہونا پڑا اور فلاسفہ قدیم کے اقوال کو اس کے ذریعہ رد کرنے کے لئے کمر ہمت باندھنی پڑی۔ تاکہ الٰہیات، ایمان باللہ، روز آخرت، انبیاء اور معجزات سے متعلق ان کے فاسد عقائد اور خراب اقوال کا پول کھل جائے اور مسلمانوں پر ان کے فلسفہ کی حقیقت واضح ہو جائے جس کی بناء پر انہوں نے اپنی کم علمی سے اپنے عقائد کی دیوار کھڑی کی ہے۔''

علم فلسفہ میں یہ کتاب قابل قدر ہے۔ خصوصیت کے ساتھ صوفیا کے

مسلک کی جس خوبی سے وضاحت کی ہے اور انہیں اجاگر کرتے ہوئے فلاسفہ قدیم کی گمراہی کی نشاندہی کی گئی ہے وہ محض انہی کا حصہ ہے۔ اس موضوع پر اس سے اچھا لکھنے والا آج تک کوئی پیدا نہیں ہوا۔

(۹) الجام العوام عن علم الکلام

یہ ۴۵ صفحات پر مشتمل ایک رسالہ ہے جسے ۱۹۳۲ء میں محمد علی عطیہ الکنی نے طبع کرایا تھا۔ اسی کا ایک نسخہ میرے سامنے اس وقت ہے۔

کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ علم کلام پر یہ ایک قابل قدر رسالہ مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔

(الف) فی شرح الاعتقاد السلف و بیان الوظائف السبعة

(ب) فی اقامة البرهان علی ان الحق مذهب السلف

(ج) فی فصول متفرقة و ابواب نافعة فی هذا لافن

حمد نعت کے بعد کتاب کی تصنیف کی وجہ اور موضوع کا ذکر اس طرح ہے:

فقد سالتنی ان ارشدک الله عن الاخبار الموهمة للتشبیهه عند الرعاع و الجهال من الخشویة الضلال حیث المتفدو، افی الله و صفاته ما بتعالی و یتقد س عنه من الصورة و الید والقدم و النزول

تم نے مجھ سے سوال کیا ہے (اللہ تعالیٰ تجھ کو ہدایت دے) ان احادیث و اخبار کے سلسلہ میں جو کمینہ لوگوں کی ذلیل حرکت اور جہالت کی بنیاد پر اصل سے تشبیہہ کے لئے مان لیا جاتا ہے اس لئے کہ وہ لوگ اللہ کی ذات وصفات کے بارے میں عقیدہ رکھتے ہیں اور اللہ کو صورت، ہاتھ، پاؤں اور دنیا میں نازل ہونے وغیرہ سے پاک ومنزہ سمجھتے ہیں۔

(۱۰) کتاب المنحول فی اصول الفقه

(قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری عربی ۷۶۹)

۱۰۵ اوراق۔ ہر صفحہ پر اوسطاً ۱۹ سطریں ہیں۔ کتابت تقریباً دسویں صدی ہجری کی بخط نستعلیق ہے۔

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے کہ اس کتاب کا تعلق اصول فقہ سے ہے، لیکن اس کتاب میں امام غزالی نے شافعی المذہب ہونے کا مکمل ثبوت دیا ہے اور دوسرے ائمہ، امام ابو حنیفہ، امام احمد اور امام مالک یا ائمہ معتزلین کے اصول پر تنقیدیں کی ہیں۔ ان کو رد کرتے ہوئے آخر میں حضرت امام شافعی کے مسلک اختیار کرنے کی مکمل و مدلل وجہ بیان کی ہے۔

کتاب میں مقدمہ کے بعد اصل موضوع پر بحث شروع ہوتی ہے جسے مندرجہ ذیل گیارہ ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) کتاب الاول، یہ دو ابواب پر مشتمل ہے

(۱) فی حقائق العلوم (۲) فی ماخذ العلوم و مصادر ہا

(۲) کتاب البیان، یہ تین فصلوں اور مختلف مسائل پر مشتمل ہے۔

(۳) کتاب الاوامر

(۴) کتاب العموم والخصوص

(۵) کتاب التاویل

(۶) کتاب المفہوم

(۷) کتاب الاخبار

(۸) کتاب القیاس

(۹) کتاب الترجیح

(۱۰) کتاب الاجتہاد

(۱۱) کتاب الفتویٰ

ان تمام مسائل مذکورہ کی وضاحت کے بعد آخر میں ایک باب اور درج

ہے جس کا عنوان ہے باب فی بیان تقدیم مذهب الشافعی علی سائر المذاهب

(۱۱) القسطاس المستقیم

یہ کتاب ایک مناظرہ کے بعد تصنیف کی گئی ہے جو امام غزالی اور ایک شیعی امام کے درمیان دمشق جاتے ہوئے ہوا۔ اس کا اصل نسخہ کمیاب ہے۔ لیکن شیخ قاضی محمد کی شرح کے ساتھ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں (قلمی عربی ۱۲۲۷) موجود ہے۔ یہ کتاب بیان عقائد اہل سنت والجماعت اور رد عقائد شیعی پر مشتمل ہے۔

(۱۲) جواهر القرآن قلمی خدا بخش لائبریری پٹنہ (عربی ۱۲۹۶)

کتبہ بخط نسخ، کتابت تقریباً گیارہویں صدی ہجری کی ہے۔ تعداد اوراق ۲۵۶ ہے ہر صفحہ پر اوسطاً ۱۱ سطریں ہیں۔

کتاب تین قسموں پر منقسم ہے۔ پہلی دو قسموں میں مختلف اسلامی تعلیمات کی وضاحت آیات قرآنی کے حوالے سے کی گئی ہے۔ تیسری قسم میں الاربعین فی اصول الدین کو بھی شامل کر لیا گیا ہے، جسے ایک علاحدہ کتاب کی شکل میں بھی مختلف لوگوں نے نقل کیا ہے۔ چنانچہ خدا بخش لائبریری میں بھی یہ کتاب الاربعین فی اصول الدین کے نام سے موجود ہے۔ اس قسم کو امام غزالی نے بھی بقیہ دونوں قسموں سے علیٰحدہ رکھا ہے تاکہ جو شخص چاہے اس سے علاحدہ طور پر بھی مستفید ہو سکے۔ امام غزالی جواہر القرآن میں تحریر فرماتے ہیں:

اسم هذا القسم کتاب اربعین فی اصول الدین فمن شاء ان یکتبه مفردا فلیکتب فانه مشتمل علی زبدة القرآن (جواہر القرآن ص ۱۲۷ الف) اس قسم کا نام کتاب اربعین فی اصول الدین ہے جو شخص یہ چاہے کہ اسے علیٰحدہ کتاب کی شکل میں لکھے تو وہ لکھ سکتا ہے اس لئے کہ یہ قسم جوہر قرآنی پر مشتمل ہے۔

پوری کتاب مسائل تصوف کی وضاحت پر مشتمل ہے اور ہر مسئلہ کی

وضاحت بالدلیل آیت قرآنی کے حوالے سے کرتے ہوئے اصول صوفیاء کی اہمیت کو بتایا گیا ہے۔اس کتاب میں امام غزالی نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ یہ کتاب انہی لوگوں کے لئے مفید ہوسکتی ہے جو اپنے آپ کو مکمل طور پر تعلیمات اسلامی کا پیرو بنالیں اور خداوندقدوس کے سوا کسی پر بھروسہ نہ کریں چنانچہ رقم طراز ہیں

و حرام علی من یقع هذ الکتاب بیده ان یظهره الا علی من استجمع بهذ ه الصفات (جواہر القرآن ص ۹۷ الف) جو شخص ان صفات مذکورہ کا حامل نہ ہو اس کے لئے اس کتاب کا پڑھنا حرام ہے۔

(۱۳) رسالة التسویة (فی تحقیق بیان معنی الروح)

قلمی خدابخش لائبریری پٹنہ عربی ۱۳۰۹۔ کتبہ خط نسخ۔ کتابت اندازاً تیرہویں صدی ہجری کی ہے۔تعداداوراق ۲۰۔ ہرصفحہ پراوسطاً ۲۰ سطور ہیں۔

اس کتاب میں جیسا کہ تمہید کتاب سے ظاہر ہے آیت قرآنی فاذا سویته و نفخت فیه من روحی سے متعلق ایک سوال کیا گیا ہے۔

قال امام ابو حامد محمد بن محمد الغزالی لماسئل عن قوله تعالیٰ فاذا سویته و نفخت فیه من روحی... ما التسویة و ما النفخ وما الروح ؟

امام ابوحامد محمد بن محمد غزالی سے جب آیہ قرآنی فاذا سویته ... کے متعلق سوال کیا گیا اور یہ دریافت کیا گیا کہ تسویہ، نفخ اور روح کیا چیز ہے تو انہوں نے جواب دیا۔

(۱۴) منهاج العابدین

مطبوعہ مطبع میمنہ مصر ۱۳۰۵۔ صفحات ۹۰۔ ہرصفحہ پراوسطاً ۳۵ سطریں ہیں مسائل تصوف کی وضاحت پر مشتمل یہ کتاب خصوصیت کے ساتھ متوکلانہ زندگی بسر کرنے اور اپنے سارے معاملات اللہ کے سپرد کردینے کی تعلیم دیتی ہے۔نیز

ایک صوفی اور سالک کو کن کن منازل اور مصائب سے گزرنا پڑتا ہے یا گزرنا ضروری ہے اور ایسے مواقع پر کس طرح صبر و شکر ہمت واستقلال سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے اور اس کے کیا کیا فائدے اور اثرات مترتب ہوتے ہیں انہیں بہت خوش اسلوبی اور وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔اسناد کتاب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ امام غزالی کی آخری کتاب ہے اس کے بعد کسی اور کتاب کی تصنیف و تالیف کا انہیں موقع نہیں مل سکا۔

قال الشيخ الفقيه الصالح الزاهد عبد الملک بن عبد الله غفر الله له املى على شيخى الاجل الامام الزاهد السعيد الموفق حجة الاسلام زين الدين شرف الامة ابو حامد محمد بن محمد الغزالى الطوسى قدس الله روحه و فع الله فى الجنة درجة هذا الكتاب المختصر وهو آخر كتاب صنفه (صفحہ اول مملوکہ خدا بخش لائبریری عربی ۴۸۵)

(ترجمہ) شیخ فقیہ عابد و زاہد عبدالملک بن عبداللہ (اللہ ان کی مغفرت کرے) نے کہا کہ امام غزالی نے یہ مختصر کتاب املاء کرائی اور یہ ان کی آخری تصنیف ہے۔

پوری کتاب مندرجہ ذیل سات عقبات پر منقسم ہے۔

(۱) عقبة العلم (۲) عقبة التوبة (۳) عقبة العوائق

(۴) عقبة العوارض (۵) عقبة البواعث (۶) عقبة القوادح

(۷) عقبة الحمد و الشكر

منہاج العابدین کا ایک قلمی نسخہ بھی خدا بخش لائبریری میں موجود ہے جسے ابن قاضی علاء الدین نے ۹۶۶ھ میں نقل کیا ہے۔اس کی کتابت واضح نسخ میں ہے۔ یہ نسخہ ۱۸۵ اوراق پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ پر اوسطاً ۱۷ سطریں ہیں۔ نمبر کتاب ۱۳۸۶ قلمی عربی۔

(۱۵) وقاية السالک من الآفات و المهالک

قا[illegible] بخش لائبر[illegible] ۱۳۹۲۔ کتابت خط نستعلیق اور نصف خط نسخ۔ کتبہ ۱۰۵۵ھ اوراق ۱۵۹۔ ہر صفحہ پر ۲۱ سطریں۔

یہ کتاب بھی اصول اور وقائع تصوف کی وضاحت پر مشتمل ہے۔ جس میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ راہ سلوک اور مسلک صوفیاء کو اختیار کرنے والوں کو کن کن باتوں سے احتراز کرنا چاہئے اور کس طرح نفس امارہ ان کے مقصد کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس راہ کے لئے کون سے افعال پسندیدہ اور بہتر ہیں۔ ساری کتاب مندرجہ ذیل چار انواع اور ایک خاتمہ پر منقسم ہے۔

النوع الاول فی المعاصی-النوع الثانی فی من التقسیم فی الطاعات-النوع الثالث من التقسیم فی الاخلاق المذمومة-النوع الرابع من التقسیم فی الاخلاق المحمودہ.

خاتمہ میں عزیمت کے آداب وفوائد اور طریقے بتائے گئے ہیں۔

کتاب مذکورہ الصدر میں ہر مسئلہ کی وضاحت کے سلسلہ میں قرآن کریم واحادیث نبوی یا اقوال صوفیاء سالکین کو بطور حوالہ یا سند پیش کیا گیا ہے۔

حمد وصلوۃ کے بعد کتاب کی ابتدا مندرجہ ذیل الفاظ سے ہوتی ہے۔

فان نظرهم تریاق من افاعی الصفات المذمومة الصادرة عن النفس الامارة نافع و الاکتاب من اقوالهم و افعالهم سلاح الآفات للاخلاق دافع فعندنا قوی هذا العزم قلت لا بدمن رفیق یکون نمیر له الشقیق یبصر بالعیوب و یعین عند الکروب ویرشد فی طریق السلوک الی الصواب علی منهج السنة و الکتاب.....

پس اگر وہ نفس امارہ کے ذریعہ صادر ہونے والے برے افعال سانپ (زہر) کے تریاق سے واقفیت حاصل کرلیں جو فائدہ پہنچاتے ہیں ورنہ کتابوں

میں اقوال اوران کے افعال کی شکل میں آفات کو اخلاق کے ہتھیار سے دور کرنے والے ہیں۔ میرے نزدیک یہ ارادہ بہت قوی ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ ضروری ہے کہ احباب اس برائی سے محفوظ رہیں۔ اپنے عیوب کو دیکھیں اور مصیبت کے وقت اسے معاون سمجھیں اور راہ سلوک میں اسے مرشد بنائیں جو انہیں کتاب وسنت کے سیدھے راستے کی جانب لے جائے۔

(۱۶) بداية الهداية

قلمی خدا بخش لائبریری پٹنہ عربی ۲۵۸۰ اوراق ۴۹۔

سطر ۱۸ کتابت ۱۱۰۰ھ بخط نسخ

اس کتاب کی ابتدا اگر چہ مسائل فقہیہ سے ہوئی ہے لیکن آداب وضو اور طریقۂ نماز وغیرہ کے بعد صوفیانہ مضامین اور مقامات کی تشریح ہے۔ مثلاً تزکیہ نفس، طریقہ زہد، اتقا اور پرہیز گاری وغیرہ۔

چنانچہ ورق ۲۹ الف میں ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے فرماتے ہیں

فاحفظ لسانک من ثمانية الاول الكذب الثانی الخلف فی الولد الثالث حفظ اللسان من الغيبة. و الرابع الجراء و الجدل و مناقشة الناس فی الكلام الخامس تزكية النفس السادس اللعن. السابع حفظ لسانک من الدعا علی احد من خلق الله و ان ظلمک و كل امره الی الله الثامن من المزاح و السخرية و الا ستهزاء بالناس فاحفظ لسانک منه.

اپنی زبان کو آٹھ چیزوں سے محفوظ رکھو: جھوٹ، وعدہ خلافی، علم کلام میں لوگوں سے لڑائی جھگڑا اور مناقشہ وغیرہ، احساس برتری، لعنت، اگر تم پر کوئی ظلم کرتا ہو تو اس کے حق میں بددعا سے بچو، اس لئے کہ تمام باتیں اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہیں۔ لوگوں کے ساتھ ہنسی مذاق سے اپنی زبان کو محفوظ رکھو۔

اسی طرح آگے چل کر بھی منہیات راہ سلوک کی وضاحت اور حسن اخلاق صلاح صدق اور زہد وغیرہ کی تعریف کرتے ہوئے حقیقی معنوں میں ان محاسن پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ چنانچہ زہد کے متعلق تحریر فرماتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے ''چوتھا زہد ہے لہٰذا تم دنیا کی حرص رکھنے والوں کی صحبت میں نہ رہو اس لئے کہ حریص دنیا کی صحبت سم قاتل ہے، کیونکہ انسان بالطبع دوسرے کا رنگ اختیار کرنے اور اقتداء کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور اس کا علم بھی نہیں ہوتا اس لئے حریص کی صحبت حرص بڑھائے گی اور زاہد کی صحبت سے تمہارے زہد میں اضافہ ہوگا' ورق ۴۳ الف

اس جلد میں امام غزالی کی مندرجہ ذیل رسائل بھی شامل ہیں:

(۱۷) العلق النفس تعداد ورق ۲۲ در بیان تصوف

(۱۸) کتاب الکشف و التبیین تعداد ورق ۹۱ مطبوعہ

اس رسالہ میں مصنوعی صوفیا کے کذب و افتراء پردازی عیش و عشرت اور یاد حق سے غفلت وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اور عبادات بدنی و مالی محض دکھاوے کے لئے ادا کرنے والے ریاکاروں کے چہرے پر سے پردہ اٹھالیا گیا ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع کی نوعیت کے اعتبار سے قابل قدر اور لائق تحسین ہے۔ کیونکہ امام غزالی گروہ صوفیا سے گہرا تعلق رکھنے کے باوجود ان کے نقائص کو نظر انداز نہیں کرتے بلکہ ان کی ریاکاری اور بے راہ روی پر کڑی تنقید کرتے نظر آتے ہیں۔

(۱۹) مشکوٰۃ الانوار تعداد ورق ۳۰

یہ رسالہ بھی صوفیا کے مسلک کے مطابق ہے۔ آیت قرآنی ''اللہ نور السموات و الارض'' کی تشریح کرتے ہوئے انوار الٰہیہ کی حقیقت اور اسرار و رموز کی وضاحت پر مشتمل ہے۔

(۲۰) رسالۃ فی المواعظ تعداد ورق ۱۶ء/۱

یہ رسالہ امام غزالی نے اپنے ایک شاگرد کی اصلاح کی خاطر اس کے سوال کے جواب میں تحریر کیا ہے چنانچہ رسالہ کی ابتداء اس حقیقت کی جانب مشیر ہے (ترجمہ)

"اے پیارے لڑکے اور محبّ صادق اللہ تمہاری عمر کو اپنی اطاعت میں طویل کرے اور تمہیں اپنے دوستوں کی راہ پر چلائے۔ بیشک مشہور اور عام نصیحتیں نبی علیہ وسلم کے خزانہ میں لکھی ہوئی ہیں۔ اگر تمہاری پہنچ ان نصیحتوں تک ہو چکی ہے تو پھر ہماری نصیحت کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر تمہاری پہنچ ان تک نہیں ہوئی ہے تو تم بتاؤ کہ گزرے ہوئے طریقوں پر چلنے سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا"

(۲۱) رسالة مالا بد منه

قلمی خدابخش لائبریری پٹنہ ۲۶۱۶/۳ عربی ورق ۴

سطریں ہر صفحہ پر اوسطاً ۲۰ ہیں۔ کتابت بارہویں صدی ہجری کی خط نسخ میں ہے۔ یہ رسالہ امام غزالی نے شوافع کے اعمال واعتقاد ضروریہ سے متعلق تحریر فرمایا ہے مختصر ہونے کے باوجود جامع اور مانع ہے۔ کتاب کی ابتدا اس طرح ہے (ترجمہ)

"جان لو کہ ہر مسلمان بالغ عاقل پر دن رات میں اس کے بالغ ہونے سے لے کر موت کے وقت تک چار سو چالیس فرائض عائد ہوتے ہیں خواہ وہ مرد ہو یا عورت، مالدار ہو یا محتاج، عالم ہو یا جاہل، آزاد ہو یا غلام، بادشاہ یا حاکم ہو یا رعایا۔ اس کے واجب ہونے کا عقیدہ رکھنا، اس کی تعلیم دینی اور اس پر عمل کرنا بھی واجب ہے اور اس کے وجوب کے عقیدہ کو ترک کرنا یا اس میں سے کچھ کا ترک کرنا ہرگز جائز نہیں۔"

(۲۲) کتاب الوجیز مطبوعہ مطبع محمد آفندی مصر ۱۳۱۸ھ

صفحات ۱۷۷ ہر صفحہ پر اوسطاً ۲۹ سطریں۔

یہ کتاب امام شافعی کے مسلک کے مطابق فقہی مسائل پر مشتمل ہے، جس کے اندر تمام ارکان اور احکام شرعیہ پر مکمل و مدلل بحث کی گئی ہے۔ مثلاً کتاب کی ابتدا

عام فقہی کتابوں کے نہج پر کتاب الطہارت سے ہوتی ہے۔اس کے بعد کتاب الصلوٰۃ، کتاب الصوم، کتاب الحج اور کتاب البیع وغیرہ کے بعد کتاب ''قسم الصدقات'' پر ختم ہو جاتی ہے۔کتاب ہذا کی ابتدا حمد وصلوٰۃ سے ہوتی ہے جس کی عبارت مقفع اور مسجع ہے اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

الحمد لله على نعمه السا بغة ومننه السائغة و اتوكل عليه بمعرفة يستحقر في ضيائها نور الشمس البازغة و بصيرة تنخنس دون بهائها و ساوس الشيطان النازغة

اللہ کے اس وسیع انعام اور بے پایاں احسانات پر اس کا شکر ادا کرتا ہوں اور میں اس کی معرفت پر بھروسہ کرتا ہوں کہ اس کی روشنی نے آفتاب کی چمک کو ذلیل کر دیا ہے اور اس کی بصیرت تمام فاسد خیالات اور وساوس شیطانیہ کو یکسر غائب و معدوم کر دے گی۔

(۲۳) محک النظر فی المنطق

مطبوعہ مطبع ادبیہ مصر صفحات ۱۳۳ ہر صفحہ پر ۱۸ سطریں ہیں

موضوع کتاب، کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔مقدمہ کتاب کے بعد قیاس کی شرطیں بیان کی گئی ہیں اور اس کے بعد قیاس کو مندرجہ ذیل فنون پر تقسیم کر دیا گیا ہے۔

الفن الاول من القياس في السوائق

الفن الثاني من محك القياس في المقاصد

الفن الثالث من المقاصد

اس کے بعد دوسری فصل مدارک الیقین والاعتقاد کے عنوان سے ہے۔ اس میں سات قسمیں شامل ہیں۔پھر تیسرا فن متعین کر کے لواحق قیاس کو مفصلا بیان کیا گیا ہے۔اس کے بعد ایک علاحدہ فن قائم کر کے قوانین اور اصول قیاس کو بالتفصیل

بیان کیا گیا ہے۔ پھر سب سے آخر میں ان اصول وقواعد کے مطابق قیاس کو پرکھنے اور اس کے کھرے کھوٹے ثابت کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ حمد وصلوٰۃ کے بعد کتاب ہذا کی عبارت اس طرح ہے:

فان صدق اقتضائک ایھا الاخ فی الدین حشرنا اللہ و ایاک فی جملة المتجابین وفیة "تحریر محک النظر و الافتکار" لیعصمک عن مکامن الغلط

اے میرے دینی بھائی اللہ میرا اور تمہارا حشر مقبول بندوں کے زمرہ میں کرے۔ اگر تم اپنے تقاضہ میں سچے ہو تو تمہارے لئے یہ کتاب "**محک النظر و الافتکار**" کافی ہوگی جو تمہیں غلطیوں اور خرابیوں سے بچائے رکھے گی۔

کتابیات

(الف) فہرست کتب علم کلام

ذیل میں ان کتابوں کی فہرست دی جارہی ہے جو علم کلام کے موضوع پر پانچویں صدی ہجری تک تصنیف کی گئیں۔اوراس وقت دنیا کے کسی نہ کسی کتب خانے میں موجود ہیں۔لیکن یہ دعویٰ کرنے سے میں اپنے کو قاصر پاتا ہوں کہ اس فہرست میں ان تمام کتب علم کلام کو شامل کرلیا گیا ہے جو اس وقت دنیا کے کسی حصے میں موجود ہیں۔ہاں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، بانکی پور، پٹنہ سے مختلف کتب خانوں کے جو کیٹلاگ مل سکے،ان کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا گیا ہے۔اوراس کے بعد اس فہرست کو مرتب کیا گیا ہے۔کتابوں کی فہرست مرتب کرتے وقت مصنف کے سن وفات کا خیال رکھا گیا ہے۔

اسمائے کتب	اسمائے مصنف/مولف	سنہ وفات	کتب خانہ
فقہ اکبر	امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت	۱۵۰ہجری	مدرسہ شمس الہدیٰ
وصیت امام اعظم	,,	,,	مکتبہ قولہ مصر
الفقہ الاکبر فی التوحید	امام ابوعبداللہ ادریس الشافعی المطلبی	۲۰۴ھ	مکتبہ خدیو مصر
الفقہ الاکبر فی التوحید	امام ابوعبداللہ ادریس الشافعی المطلبی	۲۰۴ھ	مکتبہ آصفیہ حیدرآباد
مناظرہ امام شافعی	امام ابوعبداللہ ادریس الشافعی المطلبی	۲۰۴ھ	مکتبہ آصفیہ حیدرآباد
الحیدۃ الاعتذار	عبدالعزیز بن یحییٰ بن مسلم کنانی مالکی	۲۴۰ھ	خدابخش لائبریری
الرد علی الجہمیہ	امام احمد بن محمد بن حنبل بن ہلال	۲۴۱ھ	مکتبہ قولہ مصر
الرد علی الزنادقۃ والجہمیہ	امام احمد بن محمد بن حنبل بن ہلال	۲۴۱ھ	برٹش میوزیم
کتاب السنۃ	ابوعبدالرحمن عبداللہ بن احمد بن حنبل	۲۹۰ھ	خدابخش لائبریری

اسمائے کتب	اسمائے مصنف/ مولف	سنہ وفات	کتب خانہ
مجموعہ الکتب	امام یحیٰ بن حسین بن القسم بن ابراہیم	۲۹۸ھ	برٹش میوزیم
الرسالہ المنظومہ فی العقیدہ	احمد بن محمد سبط امام شافعی	۳۰۰ھ	خدابخش لائبریری
مجموعہ اقوال امام احمد بن حنبل	ابوبکر الخلال بغدادی	۳۱۱ھ	برٹش میوزیم
عقائد الطحاوی	امام ابوجعفر احمد بن محمد الطحاوی	۳۲۱ھ	مکتبہ خدیو مصر
رسالہ فی اصول الدین	امام ابوجعفر احمد بن محمد الطحاوی	---	مکتبہ گوتھا
کتاب الابانۃ عن اصول الدیانۃ	امام ابوالحسن اشعری	۳۳۰ھ	شمس الہدیٰ
رسالہ فی الایمان	امام ابوالحسن اشعری	۳۳۰ھ	مکتبہ خدیو مصر
رسالہ امتحان الخوص	امام ابوالحسن اشعری	۳۳۰ھ	خدابخش لائبریری
رسالہ امتحان الخوص	امام ابوالحسن اشعری	۳۳۰ھ	ریسرچ لائبریری پٹنہ
کتاب اللمع	امام ابوالحسن اشعری	۳۳۰ھ	برٹش میوزیم
شرح فقہ اکبر	امام ابومنصور ماتریدی سمرقندی	۳۳۳ھ	مکتبہ آصفیہ حیدرآباد
السواد الاعظم	امام اسحاق بن محمد بن اسماعیل سمرقندی	۳۴۲ھ	مکتبہ خدیو مصر
رسالہ فی بیان الایمان جزء من العمل	،،	۳۴۲ھ	مکتبہ قولہ مصر
عمدۃ الادلۃ	محمد بن عبدالرحمٰن بصری الخلعی	۳۸۰ھ	مکتبہ برلن
تصحیح الاعتقاد الامامیہ	شیخ ابوجعفر ابن بابویہ القمی	۳۸۱ھ	مکتبہ آصفیہ حیدرآباد
کتاب التوحید	شیخ ابوجعفر ابن بابویہ القمی	۳۸۱ھ	مکتبہ آصفیہ حیدرآباد
کتاب النعمۃ فی اثبات الغیبۃ وکشف الحیرۃ	،،	۳۸۱ھ	خدابخش لائبریری
ذم الکلام	عبداللہ بن محمد بن علی الھروی	۳۸۱ھ	مکتبہ برلن
عقاید	امام ابومحمد عبداللہ بن ابی زید قیروانی	۳۸۶ھ	مکتبہ خدیو مصر
رسالہ	امام نصر بن محمد بن احمد بن ابراہیم	۳۹۳ھ	مکتبہ خدیو مصر
شرح الفقہ الکبر	امام نصر بن محمد بن احمد بن ابراہیم	۳۹۳ھ	مکتبہ خدیو مصر

اسمائے کتب	اسمائے مصنف/مولف	سنہ وفات	کتب خانہ
المسائل الخلاف بین البصرئین ولبغدادین،	شیخ سعید نیشاپوری	۴۰۰ھ	مکتبہ برلن
ارشاد	شیخ المفید محمد بن محمد نعمان	۴۱۳ھ	مکتبہ آصفیہ حیدرآباد
ردصوفیہ	شیخ المفید محمد بن محمد نعمان	۴۱۳ھ	مکتبہ آصفیہ حیدرآباد
المجموع فی المحیط بالتکلیف	قاضی عبدالجبار معتزلی	۴۱۵ھ	مکتبہ برلن
اجوبۃ مسائل	ابوعلی الحسین بن عبداللہ بن سینا	۴۲۸ھ	مکتبہ برلن
شافی	سید مرتضی علم الہدی	۴۳۶ھ	مکتبہ آصفیہ حیدرآباد
اعلام النبوۃ	ابوالحسن علی بن محمد الماوردی الشافعی	۴۵۰ھ	مکتبہ آصفیہ حیدرآباد
الوصل فی الملل والاھواء النحل	علامہ ابن حزم ظاہری	۴۵۶ھ	شمس الہدی پٹنہ
تلخیص الشافعی	ابوجعفر محمد بن حسن بن علی الطوسی	۴۵۸ھ	مکتبہ آصفیہ حیدرآباد
الاسماء والصفات	احمد بن حسین بن علی البیہقی	۴۵۸ھ	خدابخش لائبریری
لمع فی الاعتقاد	ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن	۴۶۵ھ	مکتبہ خدیومصر
الفصول فی الاصول	ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن	۴۶۵ھ	مکتبہ خدیومصر
کتاب الارشاد فی اصول الاعتقاد	امام الحرمین جوینی	۴۷۸ھ	مکتبہ بتاوے
غیاث الامم	امام الحرمین جوینی	۴۷۸ھ	خدابخش لائبریری
التمہید فی بیان التوحید	ابوشکور محمد بن عبدالسید بن شعیب	۵۰۰ھ	خدابخش لائبریری
اصول الدین	ابوالحسن بن محمد بن علی الطبری	۵۰۴ھ	مکتبہ خدیومصر
الاقتصاد فی الاعتقاد	امام غزالی	۵۰۵ھ	مکتبہ خدیومصر
امان العبد بالتصدیق	امام غزالی	۵۰۵ھ	مکتبہ خدیومصر
التجرید فی کلمۃ التوحید	امام غزالی	۵۰۵ھ	مکتبہ خدیومصر
رسالہ	امام غزالی	۵۰۵ھ	مکتبہ خدیومصر
اسمائے کتب	اسمائے مصنف/مولف	سنہ وفات	کتب خانہ

فیصل التفرقہ بین الاسلام والزندقہ	امام غزالی	۵۰۵ھ	مکتبہ خدیو مصر
فیصل التفرقہ بین الاسلام والزندقہ	امام غزالی	۵۰۵ھ	مکتبہ قولہ مصر
رسالۃ القدسیہ	امام غزالی	۵۰۵ھ	مکتبہ خدیو مصر
رسالۃ الغزالی	امام غزالی	۵۰۵ھ	مکتبہ قولہ مصر
الرسالۃ الوعظۃ الاعتقادیہ	امام غزالی	۵۰۵ھ	مکتبہ قولہ مصر
العقیدہ	امام غزالی	۵۰۵ھ	مکتبہ گوتھا
دقائق الاخبار (مترجم)	امام غزالی	۵۰۵ھ	مکتبہ آصفیہ حیدر آباد
العلق المضنون بہ علی غیر اہلہ	امام غزالی	۵۰۵ھ	مکتبہ آصفیہ حیدر آباد
قواعد علم الکلام	امام غزالی	۵۰۵ھ	مکتبہ آصفیہ حیدر آباد
المضنون بہ علی غیر اہلہ	امام غزالی	۵۰۵ھ	مکتبہ آصفیہ حیدر آباد
شفاء العلیل فی القیاس والتعلیل	امام غزالی	۵۰۵ھ	مکتبہ برلن
کتاب فضائح الباطنیہ	امام غزالی	۵۰۵ھ	مکتبہ ای جی براؤن
کتاب الرسالۃ الدینیہ	امام غزالی	۵۰۵ھ	برٹش میوزیم
الدرۃ الفاخرہ فی کشف علوم الآخرہ	امام غزالی	۵۰۵ھ	برٹش میوزیم
ترجمہ عقیدۃ اہل السنۃ	امام غزالی	۵۰۵ھ	مکتبہ برلن
معارج القدس فی مدارج معرفۃ النفس	امام غزالی	۵۰۵ھ	ریسرچ لائبریری پٹنہ
الجام العوام عن علم الکلام	امام غزالی	۵۰۵ھ	مدرسہ شمس الہدی
القسطاس المستقیم	امام غزالی	۵۰۵ھ	خدا بخش لائبریری
رسالۃ التسویہ	امام غزالی	۵۰۵ھ	خدا بخش لائبریری

کتابیات

(ب) مآخذ

اس عنوان کے تحت ان کتابوں کی فہرست دی جارہی ہے جو اس کتاب کی ترتیب، تبویب اور تدوین میں ممد ومعاون ثابت ہوئی ہیں۔ یا ترتیب کے دوران زیر مطالعہ رہی ہیں:

۱	الملل و النحل	شہرستانی
۲	المنیۃ الامل فی شرح ملل و النحل	مرتضیٰ زیدی
۳	الفصل فی الاھواء الملل و النحل	ابن حزم
۴	الفرق بین الفرق	عبدالقاہر بغدادی
۵	شرح عقائد نسفی	
۶	فقہ اکبر	امام اعظم ابوحنیفہؒ
۷	ضحیٰ الاسلام	احمد امین
۸	فجر الاسلام	احمد امین
۹	ظہر الاسلام	احمد امین
۱۰	مقدمہ ابن خلدون	ابن خلدون
۱۱	تاریخ ابن خلدون	ابن خلدون
۱۲	تاریخ طبری	طبری
۱۳	تاریخ کامل	ابن اثیر
۱۴	تاریخ الخلفاء	سیوطی
۱۵	تاریخ بغداد	خطیب بغدادی
۱۶	تاریخ الجھمیہ و المعتزلہ	
۱۷	تاریخ ادبیات ایران	ذبیح اللہ صفا

۱۸	تاریخ ادبیات ایران	رضازادہ شفق
۱۹	لٹریری ہسٹری آف عربیہ	نکلسن
۲۰	انسائیکلوپیڈیا آف اسلام	
۲۱	علم الکلام	شبلی نعمانی
۲۲	الکلام	شبلی نعمانی
۲۳	المامون	شبلی نعمانی
۲۴	الغزالی	شبلی نعمانی
۲۵	البرامکہ	عبدالرزاق کانپوری
۲۶	مروج الذہب	مسعودی
۲۷	وفیات الاعیان	ابن خلکان
۲۸	کتاب تاريخ آداب اللغة	
۲۹	فوات الوفیات	ابن شاکر کتبی
۳۰	شذرات الذہب	
۳۱	بغیۃ الوعاۃ	
۳۲	اخبار الحکماء	
۳۳	معجم الادباء	
۳۴	میزان لاعتدال فی اسماء الرجال	
۳۵	طبقات الشافعیہ الکبریٰ	تقی الدین سبکی
۳۶	جواہر المضیہ فی طبقات الحنفیہ	
۳۷	طبقات الاحناف	قلمی
۳۸	طبقات السادۃ الجمال الحنفیہ	قلمی
۳۹	حدائق الحنفیہ (اردو)	
۴۰	کتاب الاغانی	

۴۱	کتاب الامالی	ابو عبداللہ محمد بن عباس
۴۲	کتاب الانساب للمقدسی	
۴۳	کتاب الکنی والاسماء	للدولابی
۴۴	کتاب الانساب	للسمعانی
۴۵	کتاب الفہرست	ابن ندیم
۴۶	نفح الطب	
۴۷	البیان والتبیین	جاحظ
۴۸	دائرۃ المعارف اسلامی	
۴۹	روضة البهميه فيما بين الاشاعره و الماتريديه	
۵۰	باب ذكر المعتزله	
۵۱	کشف الظنون	
۵۲	ہدایۃ العارفین	
۵۳	نگار۔علوم اسلامی نمبر	
۵۴	نگار۔معلومات نمبر سالنامہ ۱۹۵۸ء	
۵۵	نگار۔سالنامہ ۱۹۵۵ء	
۵۶	رسالہ استحسان الخوض للعشری	
۵۷	کتاب الابانۃ عن اصول الدیانۃ للعشری	
۵۸	الجاحظ	حنا فاخوری
۵۹	معتزلہ	زہدی حسن لجاز اللہ
۶۰	کتاب الحیوان	للجاحظ
۶۱	کتاب البخلاء	للجاحظ
۶۲	رسائل للجاحظ	للجاحظ
۶۳	رسالة التربيع و التدوير	للجاحظ
۶۴	شرح اسرار احیاء العلوم	
۶۵	منتہی الادب	

۶۶ غیاث اللغات — ۶۷ المنجد

۶۸ صراح — ۶۹ مشکل الحدیث لابن فورک

۷۰ جامع ترمذی — ۷۱ تہافة الفلاسفه للغزالی

۷۲ المنقذ من الضلال — ۷۳ احیاء العلوم

۷۴ کیمیائے سعادت — ۷۵ المستصفی

۷۶ معارج القدس فی مدارج معرفة النفس — للغزالی

۷۷ القصیدة الهائیه — ۷۸ القصیدة لاتائیه

۷۹ الجام العوام عن علم الکلام

۸۰ کتاب المنخول فی اصول الفقه — ۸۱ القسطاس المستقیم

۸۲ جواہر القرآن — ۸۳ رسالة التسویة

۸۴ منہاج العابدین — ۸۵ وقایة السالک

۸۶ ہدایة الہدایه — ۸۷ العلق النفیس

۸۸ کتاب الکشف والتبیین — ۸۹ مشکوٰة الانوار

۹۰ رسالہ فی المواعظ — ۹۱ رسالہ مالا بدمنه

۹۲ کتاب الوجیز

۹۳ محک النظر فی المنطق — امام غزالی

۹۴ صحبة الغزالی — ابوبکر عبدالرزاق

۹۵ سرگزشت غزالی — محمد حنیف ندوی

۹۶ دول الاسلام — شمس الدین ابوعبداللہ

۹۷ تاریخ اسلام — اکبر علی شاہ

۹۸ تاریخ الامت — سلم جیراج پوری

خاتمه بالخیر

مصنف کی مطبوعات

(۱) کہکشاں ڈاکٹر محمد ہاشم کی غزلوں کا انتخاب وترتیب

(۲) وسیلۂ شرف مصنفہ حضرت صوفی منیری (مع اضافہ)

(۳) سامان رسوائی شعری مجموعہ

(۴) صوفیائے بہار کے ملفوظات ومکتوبات

(۵) علم کلام اور علمائے متکلمین

زیر طبع

اردو ناول - ایک تنقیدی جائزہ

مصنف کی مطبوعات

(۱) کہکشاں ڈاکٹر محمد ہاشم کی غزلوں کا انتخاب وترتیب

(۲) وسیلۂ شرف مصنفہ حضرت صوفی منیری (مع اضافہ)

(۳) سامان رسوائی شعری مجموعہ

(۴) صوفیائے بہار کے ملفوظات ومکتوبات

(۵) علم کلام اور علمائے متکلمین

(۶) اردو ناول - ایک تنقیدی جائزہ (زیرطبع)